ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی۔ ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور۔ پاکستان)۔ کیا وہ پھر بھی مجوسی اثر میں ہیں؟ اسی سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنا مناسب ہوگا۔

اللہ رب العزت نے رسول اللہ ﷺ کا نام محمد۔ احمد رکھا ہے۔ اور یہ قرآن کریم میں ہے۔ مگر آج ہزاروں لوگوں کے نام میں یہ اسم گرامی شامل ہے اور ان میں سے بعض لوگ جرائم کرتے ہیں۔ گناہ کرتے ہیں۔ اخباروں رسائل میں چھپ کر یہ نام مبارک ردی میں بھی چلا جاتا ہے تو کیا نام محمد ﷺ استعمال کرنا اسلام دشمنی یا مجوسی اثر ہے؟ یا یہ کہ کوئی اپنے نام میں محمد ﷺ نہ شامل کرے اور نہ یہ نام محترم شیع ہو؟ بات کا بتنگڑ نہیں بنانا چاہئے۔

پھر کہتا ہوں کہ معاملہ نیت کا ہے۔ سیاق وسباق سے ہٹ کر بلا حوالہ۔ بلا تحقیق" کہا جاتا ہے" کی بنیاد پر سارے مضمون وتنقید کو علمی انداز نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اردو کے معاملہ میں جن لوگوں پر اعتراض ہوا ہے وہ تو اردو کے بھی آباؤ اجداد ہیں۔ آگے ایک جگہ قریشی صاحب نے لکھا ہے" قرآن اللہ کی تصنیف ہے"۔ یہ بھی محل نظر ہے۔ قرآن اللہ کی تصنیف نہیں اللہ کا کلام ہے۔ اسے تصنیف کر کے دی یا نازل نہیں کیا گیا بلکہ الفاظ وقرأت وکلام کی تقریر کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا گیا۔ یہ الزام نہیں بلکہ تصحیح ہے تاکہ دوسرے یہ غلطی نہ کریں۔

آج بھی سابقین کے ترجمہ قرآن وحدیث کو متروک یا ناقابل فہم یا قدیمی ہونے کے باعث ترک کیا جارہا ہے۔ نئے نئے ترجمے نئی سائنسی دریافت کی روشنی میں سامنے آرہے ہیں۔ ایسا قیامت تک ہوتا رہیگا۔ مگر متن قرآن تبدیل نہ ہوا ہے نہ بدلے گا۔ اللہ اس کی حفاظت کررہا ہے۔ ترجمہ کے لئے اس حفاظت کی گارنٹی نہیں دی گئی ہے۔

آخر میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کسی تحریر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر محمد عثمان قریشی کے دعوی کو تسلیم کرلیا جائے تو بہت سے محترم گذرے ہوئے اور جید حیات مترجمین کے سارے ترجمے رد کرنے ہوں گے۔ (کیونکہ خدا کا لفظ استعمال کرنے کے سبب ہی مجوسی زدہ ہیں)۔

شاید کوئی ڈگری یافتہ شخص "خدا" کا لفظ استعمال کئے بغیر کلام اللہ کا ترجمہ لائے تو بڑا احسان ہوگا۔ قبول ورد کا فیصلہ تو کوئی اور ہی کریگا۔ اعتراض کرنا آسان ہے مگر خود دوسروں سے بہتر کام کرنا مشکل ہے۔ الغرض ترجمہ اور تفسیر۔ وضاحت وتفہیم کیلئے اگر اللہ کو ترجمہ میں خدا لکھ دیا جائے تو اس سے نہ ایمان میں خلل آتا ہے نہ ہی کوئی مجوسی، نصرانی یا یہودی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ التفسیر کے صفحات کو خلجان پیدا کرنے کے لئے استعمال نہ کیا جائے تاکہ زیادہ مفید خدمت ہو سکے۔

جاہلیت کی حقیقت، عہدِ جاہلی کے ادبی آثار کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد عارف خان ساقی
استاذ عربی زبان وادب
شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اللہ رب ذوالجلال نے انسانیت کی بھلائی اور بہتری اور فوز وفلاح کا جو بھی نظام دیا، بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات کی شکل میں دیا۔ ساتھ ہی اس کو ذہن بھی دیا جو سوچنے اور سمجھنے کی استعداد رکھتا اور نفع ونقصان اور بھلائی وبرائی میں فرق کرسکنے کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال اور آراستہ وپیراستہ تھا۔ نفس انسانی میں قبول حق کا مادہ بھی رکھ دیا گیا اور فسق وفجور کی طرف میلان کی صلاحیت بھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **و نفس و ما سواھا، فالھمھا فجورھا و تقوٰھا** (۱) ترجمہ: قسم ہے نفس کی اور ہر اس صلاحیت کی جس نے اس نفس کو ایک متوازن نہج پر استوار کردیا، پھر اس کے فسق وفجور اور اس کے تقوی وپرہیزگاری کو اس کے دل میں ڈال دیا۔

ایسے میں انسانی ذہن کی اہمیت اور قدر وقیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مگر اس کی حدود طے شدہ اور رسائی بہر حال محدود ہے۔ ادھر یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ انسان نے اکثر اپنی ان حدود سے تجاوز کیا اور ٹھوکر کھائی ہے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ تائید ایزدی سے اس کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق اور ہمت عطا ہوئی۔ ان دونوں صورتوں کا انجام قرآن حکیم میں واضح لفظوں میں بیان کر

دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے: قد افلح من زکھا، و قد خاب من دسھا (۲) ترجمہ: یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے اس کو پاکیزہ رکھا، اور یقیناً نامراد ہو گیا وہ جس نے اس کو معصیت میں ڈبو دیا۔

پہلی صورت یعنی رشد و ہدایت، نور معرفت کا ثمر ہے جبکہ دوسری صورت جہالت و گمراہی یعنی ظلمت اور تاریکی کی پیداوار۔ انسان کی یہ دونوں حالتیں ہر دور میں موجود رہی ہیں۔ نور معرفت کو عام کرنے کے لئے اسلام آیا تو اس سے پہلے کے دور کو واضح الفاظ میں "عہد جاہلیت" سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ اس عہد کی نشاندہی کے لئے جہل اور اس کے مشتقات مثلاً جاہلیت اور جہالت وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ مگر تعبیرات کی کثرت نے جاہلیت کے معنی و مفہوم میں ایک ابہام سا پیدا کر دیا ہے اور یہ طے کرنا دشوار ہو رہا ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ جاہلیت کو کس خاص معاشرتی ہیئت کذائیہ کو عیاں، نمایاں اور واضح کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ سطور ذیل میں ہم عہد جاہلی کے ادبی آثار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کلمہ کے حقیقی معنی و مفہوم تک رسائی کی کوشش کریں گے تا کہ ایک طرف جہالت و گمراہی کی بے اعتدالیوں اور بداعمالیوں کے چہرے پر پڑے خوشنما پردے دور ہونے سے ان میں چھپے قبح آشکار ہو سکیں تو دوسرے ہاتھ پہ نور معرفت کی ضیا پاشیوں کی عظمت پوری طرح سے نکھر کر نگاہوں کے سامنے آ سکے۔

جاہلیت: قرآن حکیم نے متعدد مواقع پر اسلام سے پہلے کے دور کی تباہ کاریوں اور فکری و عملی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس عہد کو "عہد جاہلیت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے تیئس سالہ عہد نبوت کا بیشتر حصہ اسی "عہد جاہلیت" کی خرابیاں اور برائیاں مٹانے اور دور کرنے اور لوگوں کا تزکیہ نفس کرنے پر صرف فرمایا۔ پھر جب اس کا زور ٹوٹ چکا تو عہد نبوی کی تکمیل کے موقع پر حجۃ الوداع جیسی ایک بہت بڑی تقریب میں آپ ﷺ نے باضابطہ طور پر اس "عہد جاہلیت" کے خاتمے کا اعلان فرمایا: الا کل شیء من امر الجاهلية تحت قدمی موضوع (۳) ترجمہ: آگاہ رہو، جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روندی پڑی ہے۔

قرآن حکیم نے بھی چار مختلف مقامات پر جاہلیت کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس عہد کی خرابیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اولاً سورۂ آل عمران میں ہے: "و طائفة قد اهمتهم انفسهم يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية" (۴) ترجمہ: اور ایک گروہ کو ان کے نفسوں نے

سوچوں میں ڈال دیا، اللہ کے بارے میں جاہلیت کی طرز کے طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے۔

پھر سورۂ مائدہ میں جاہلیت کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے: "افحکم الجاهلية يبغون ط ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون" (۵) ترجمہ: تو کیا یہ لوگ جاہلیت کی طرز کے حکم کو پسند کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے بہتر حکم کرنے والا اور ہو کون سکتا ہے؟

تیسری جگہ سورۂ احزاب میں عہد جاہلیت کی ایک اور بڑی خرابی کی نشاندہی فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى (۶) ترجمہ: اور گھروں میں رہا کرو اور سابقہ جاہلیت کی طرز کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔

جبکہ اس سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت مبارکہ کے کلمات حسب ذیل ہیں: اذ جعل الذين كفروا في قلوبهم الحمية حمية الجاهلية فانزل الله سكينته على رسوله وعلى المؤمنين والزمهم كلمة التقوى وكانوا احق بها واهلها (۷)

ترجمہ: اور یاد کیجئے وہ وقت جب کفار نے اپنے دلوں میں حمیت ٹھانی تھی، جاہلیت والی حمیت، تو اللہ تعالیٰ نے سکون نازل فرمایا اپنے رسول پر اور مومنین پر بھی اور ان کو تقویٰ والی بات پر قائم رکھا اور یہ سب اس چیز کے حقدار بھی تھے اور اہل بھی۔

مندرجہ بالا چاروں آیات میں عہد جاہلیت کی خرابیاں گنوائی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر آیت مبارکہ ایک علیحدہ برائی یا کمزوری کو موضوع بحث بناتی ہے۔ پہلی ہی آیت مبارکہ میں حق و صداقت کے مقابل ظن و تخمین کی اتباع کو قابل نفرین عمل گردانا گیا ہے۔ پھر ایک اور مقام پر ایمانیات ہی کے باب میں ظن و تخمین کی اتباع اور عقل محض کی پیروی کی اصل حیثیت کو حسب ذیل کلمات میں واضح کرتے ہوئے اس کا معنوی بھرم توڑ دیا گیا: وما لهم به من علم ط ان يتبعون الا الظن ج ان الظن لا يغني من الحق شيئا (۸) ترجمہ: اس معاملے میں انہیں کسی بھی طرح کا کچھ علم نہیں ہے، صرف اور صرف گمان کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں گمان کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

جبکہ دوسری آیت مبارکہ میں رشد وہدایت کے الہامی دستور سے لاپرواہی اور اس سے بے نیازی اور اعراض وانحراف جیسے فعل شنیع کو معرض بحث میں لایا گیا ہے۔ رشد وہدایت کا وہ دستور اور وہ اصول وضوابط جن کی بابت حضرت سیدنا آدم وحوا علیہما السلام کے عالم ارضی کی طرف مراجعت فرماتے وقت حق تعالیٰ نے واضح فرما دیا تھا: قال اهبطا منها جميعا بعضكم لبعض عدو ج فاما يأتينكم مني هدى ۵ فمن تبع هداى فلا يضل و لا يشقى ۔ ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة ضنكا و نحشره يوم القيمة اعمى. (۹)

ترجمہ: تم دونوں فریقوں (انسان اور شیاطین) کے جملہ افراد یہاں سے اتر جائیں تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو، تو جب کبھی بھی تمہاری طرف میری جانب سے کوئی ہدایت اترے گی تو جو بھی میری ہدایت کی اتباع کرے گا تو نہ تو وہ گمراہ ہو سکے گا اور نہ ہی وہ بد بخت بنے گا۔ اور جو کوئی میرے ذکر (یاد دہانی) سے روگردانی کرے گا تو حقیقت یہی ہے کہ اس کی زندگی تنگی میں رہے گی اور قیامت کے روز اس کو ہم اندھا کرکے اٹھائیں گے۔

جبکہ تیسری جگہ مذکور آیت مبارکہ میں عورتوں کے ہار سنگھار کرکے گھروں سے نکل پڑنے اور پرائے مردوں کو دعوت نظارہ دیتے پھرنے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ آج کے دور کا بھی عام چلن یہی ہے۔ دین وشریعت کی روشن تعلیمات کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے سپرد کر دینا بھی ایک جہالت ہے۔ عہد جاہلیت کے تعلق سے قرآن حکیم نے جن جن افعال شنیعہ اور نامحرمانہ سرگرمیوں کا ذکر چھیڑا ہے، عرب معاشرت پر ان کے اثرات تباہ کن حد تک گہرے تھے۔ صرف بن ٹھن کر گھروں سے نکلنے اور غیر مردوں کو خواہ مخواہ اپنی طرف راغب ومتوجہ کرنے کے عمل کا ہی جائزہ لیا جائے اور ایسا کرتے وقت اس چیز کو بھی نگاہ میں رکھ لیا جائے کہ عرب معاشرہ بنیادی طور پر ایک قبائلی معاشرہ تھا۔ ایک قبائلی معاشرے میں عورت کے وجود کے ساتھ پورے قبیلے کی عزت وغیرت اور حمیت وابستہ ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ایک قبائلی معاشرے کا سب سے قیمتی اثاثہ عورت ہی ہوتی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا مسئلہ بھی ہے۔ عورت کی حفاظت کی خاطر قبائلی لوگ سب کچھ تج دینے پر ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ اعلیٰ انسانی اقدار سے بے بہرہ رہتے ہوئے یہ چیز ایک خطرناک رخ اختیار کر لیتی ہے۔ عربوں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اپنی نام نہاد غیرت کی حفاظت کی خاطر اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے: واذا الموءدة سئلت . بأى ذنب قتلت . (۱۰) ترجمہ: اور جب سوال کیا جائے گا اس سے جو زندہ دفن کر دی گئی۔ کس گناہ کی پاداش میں تو قتل کی گئی؟

حدیث میں آتا ہے: ان رجلا اتى النبى ﷺ ، فقال: يا رسول الله! انا كنا اهل جاهلية و عبادة اوثان ، فكنا نقتل الاولاد . وكانت عندى ابنة لى فلما اجابت و كانت مسرورة بدعائى اذا دعوتها . فدعوتها يوما فاتبعتنى ، فمررت حتى أتيت بئرا من اهلى غير بعيد . فاخذت بيدها فرديتها فى البئر ، وكان آخر عهدى بها أن تقول: يا ابتاه! يا ابتاه! فبكى رسول الله ﷺ حتى وكف دمع عينيه . فقال له رجل من جلساء رسول الله ﷺ احزنت رسول الله ﷺ فقال له: كف . فانه يسأل عما أهمه . ثم قال له اعد على حديثك . فاعاده . فبكى حتى وكف الدمع من عينيه على لحيته . ثم قال له: ان الله قد وضع عن الجاهلية ما عملوا . فاستأنف عملك. (۱۱)

ترجمہ: کہ ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم لوگ جب اہل جاہلیت اور بتوں کے پجاری تھے تو ہم اپنی اولاد کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔ میرے یہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی، پھر جب وہ بات کو سننے، سمجھنے کے قابل ہو گئی تو میں جب بھی اس کو بلاتا وہ بہت خوش ہوتی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا تو وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ میں چلتا گیا یہاں تک کہ اپنے ایک خاندانی کنویں پر جو زیادہ دور بھی نہیں تھا، پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو کنویں میں پھینک دیا۔ میرے سامنے وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پکارتی ہی رہ گئی: ابا جان! ابا جان۔ رسول اکرم ﷺ رو پڑے۔ اس حد تک کہ آپ ﷺ کے آنسو بہہ نکلے۔ یہ ماجرا دیکھا تو آپ ﷺ کے رفقاء میں سے ایک نے اس شخص سے کہا: تم نے رسول اللہ ﷺ کو غمگین کر دیا۔ اس نے جواباً کہا: رکو! جو باتیں فکر میں ڈال دیتی ہیں، آپ ﷺ خود ان کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: پھر سے یہ بات بیان کرو۔ اس نے اس بات کو دہرایا تو آپ ﷺ پھر رو پڑے۔ یہاں تک کہ آنسو آپ ﷺ کی ریش مبارک پر بہہ نکلے۔ پھر آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: یقیناً اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی بداعمالیوں سے درگزر فرما دیا ہے۔ اب میدان عمل میں تم نئی زندگی کا آغاز کرو۔

عورتوں کے بن سنور کر پرائے مردوں کو اپنی جانب بے وجہ مائل کرنے کے یہ مظاہرے اگرچہ حضریت اور شہری زندگی سے متعلق ہیں جہاں آکر قبائلیت کا وہ دم خم باقی نہیں

رہتا جو کہ گاؤں دیہات میں پایا جاتا ہے۔ مگر بنیادی طور پر قبائلی مزاج ہونے کے باعث ان میں بھی اوباش قسم کے نوجوانوں کی طرف سے غیر عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے خوفناک فتنوں کے بھڑک اٹھنے کے امکانات کو قطعاً رد نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر الفاظ میں ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عرب معاشرے میں یہ عمل بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کے مترادف عمل تھا۔

اسی طرح چوتھی آیت مبارکہ میں بھی ایک ایسی بڑی برائی اور خرابی کا تذکرہ ہے جو عہد جاہلیت میں بڑی بڑی تباہکاریوں کا باعث بنتی رہی ہے۔ اور وہ ہے ''حمیت جاہلیہ''۔ یہ عہد جاہلیت کا ایک ایسا اندھا جذبہ تھا جو لوگوں کی عقل پر پردے ڈال دیتا تھا اور وہ ظلم و جور پر جری ہو جاتے اور حق و انصاف کے بھی ضابطے روند ڈالتے اور تقاضے پامال کر گزرتے تھے۔ جس کے خوفناک مظاہر آج کی مہذب کہلانے والی دنیا میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً اپنے مخالفین کی ایک سے دوسری جگہ منتقلی کے لئے ان کو کنٹینرز میں بند کر کے لے جانا۔ ننگا کر کے خون خوار کتوں کے سامنے ڈال دینا، کالے پانی سے بھی بدترین جگہ پر ان کو اس طرح سے قید میں رکھنا کہ نہ ان کو دنیا کی ہوا لگے اور نہ دنیا کو ان کی کوئی خبر ہی ہو سکے۔

یہ حمیت جاہلیہ ہی کا سب کیا دھرا تھا کہ اپنے ہم قبیلہ افراد کی ہر جائز و ناجائز معاملے میں ہر قیمت پر حمایت کرتے تھے اور اپنے بڑوں اور قبائلی سرداروں کے ماتحت، خواہ کتنا ہی ظلم و جور کا مظاہرہ ہو اور خون کی ندیاں بہہ جائیں، اپنے مخالفین کے ساتھ جنگوں سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ مشہور عرب شاعر درید بن صمہ کے مندرجہ ذیل اشعار اسی حمیت جاہلیہ کے عکاس ہیں۔ کہتا ہے۔

فلما عصوني كنت منهم وقد أرى ... غوايتهم و انني غير مهتد

أمرتهم أمري بمنعرج اللوى ... فلم يستبينوا الرشد الا ضحى غد

و هل انا الا من غزية ان غوت ... غويت و ان ترشد غزية ارشد (۱۲)

ترجمہ: تو جب میرے ہم قبیلہ افراد نے میری ایک نہ مانی تو میں ان کی گمراہی کو دیکھتا ہی رہ گیا اور حالت یہ ہوئی کہ میں بھی سیدھی راہ سے ہٹ گیا۔ میں نے ''منعرج اللوی'' کے مقام پر ان کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر اگلے روز چاشت کے وقت تک، جب مخالف قبیلہ چڑھائی کر چکا تھا، میری بات کسی طرح ان کی سمجھ میں ہی نہ آئی، اور انفرادی طور پر میری حیثیت و

شناخت ہی کیا ہے؟ میں بھی ہوں تو اسی گروہ کا ایک فرد۔ اگر یہ گروہ بھٹک جائے گا تو میں بھی ساتھ ہی بھٹک جاؤں گا اور اگر یہ سدھر جائے گا تو میں بھی اس کے ساتھ ہی سدھر جاؤں گا۔

دراصل یہی حمیت جاہلیہ کا وہ اندھا جذبہ تھا جس کے باعث رسول اکرم ﷺ کی مساعی جمیلہ کے مقابلے پر کفار و مشرکین کا فتح مکہ تک دم خم قائم اور باقی رہا۔ اور اسی کے دم قدم سے جاہلیت کا اتنے طویل عرصے تک دور قائم رہا۔

جاہلیت کے بارے میں عوامی سوچ: عام طور پر جاہلیت کے لفظ سے جو تاثر ابھر کر سامنے آتا ہے وہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ یہ کوئی ایسا دور تھا کہ اس دور کے رہنے بسنے والے لوگوں میں ہر طرف کم عقلی، بے علمی، نادانی اور ایک وحشیانہ پن پایا جاتا تھا۔ یعنی کہنے کی حد تک انسان تھے اور ان میں انسانیت نام کو نہ تھی۔ سوچنے اور سمجھنے کی ہر استعداد اور صلاحیت سے عاری تھے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کا ان لوگوں میں دور دورہ تھا، بس حرص اور ہوس پرستی چھائی ہوئی تھی۔ گویا انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور لوازمات سے کلی طور پر بے بہرہ تھے۔ یقیناً ان میں سے کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں کہ جن کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ مگر اصل صورت حال اس سے خاصی مختلف ہے۔ کچھ لوگ تو ناخواندہ اور ان پڑھ لوگوں کو جاہل سمجھتے ہیں۔ یہ چیز تو مطلقاً غلط ہے۔ بالخصوص قرآن حکیم نے جس معنی میں اس کلمے کو استعمال کیا ہے اس کے ساتھ اس معنی و مراد کو تو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اہل علم و محققین کی آراء کا بھی جائزہ لے لیا جائے تاکہ اصل مراد و مفہوم تک رسائی میں سہولت رہے۔

جاہلیت کا لغوی معنی و مفہوم: محققین نے اس کلمہ کے حقیقی معنی و مفہوم تک پہنچنے کے لئے کافی کھوج کرید سے کام لیا ہے۔ دائرۃ المعارف القرآن المعاصرین کے مقالہ نگار نے اس کلمے کا معنی بیان کرتے ہوئے اس کے جملہ مستعمل مشتقات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ لکھتا ہے:

☆ جهله ☆ يجهله جهلاً و جهالة: ضد علمه، فهو جاهل. جمعه: جُهل، جُهّال، جهلة و جُهلاء. و جهل عليه: تسافه عليه وجهّله: رماه بالجهل. و تجاهل: أرى من نفسه الجهل. واستجهله: عدّه جاهلاً. و المجهل: الارض (الفلى) لا يهتدى فيها. جمعه: مجاهل. يقال: هذا الامر مجهلة: اي يحمل على الجهل. والجاهلية: هي حالة الناس قبل بعثة رسول الله ﷺ (۱۳)

ترجمہ: ☆ جهله ☆ يجهله جهلاً و جهالة، علمه (اس نے اسے جان لیا) کی ضد ہے۔ اس

سے اسم فاعل کا کلمہ جاهل آتا ہے، اور اس کی جمع: جُهل، جُهّال، جَهَلة وجُهلاء آتی ہے۔ جب: جهل عليه کہا جاتا ہے تو مراد ہوتی ہے: اس نے اس کے ساتھ جہالت و نادانی کا برتاؤ کیا۔ جهّله کہا جاتا ہے تو کسی کو جہالت کی تہمت دینا مراد لیا جاتا ہے۔ تجاهل: کا مطلب ہے اس نے اپنی طرف سے نادانی کا اظہار کیا استجهله: اسے جاہل سمجھا۔ المَجْهَل: ایسی سرزمین یا مقام کو کہا جاتا ہے جہاں کوئی راستہ نہ ملے اس کی جمع: مَجَاهِل آتی ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: هذا الامر مَجْهَلة: یہ معاملہ جہل کا باعث ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں کی جو حالت تھی اس کو: جاهلية کہتے ہیں۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا مقالہ نگار "جاہلیت" کا معنی ومفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: واما من حيث معنى الدقيق لكلمة "جاهلية" فالراى الشائع هو ما ذهب اليه ميخاليس (G.D.Michaelis) و غيره من انها زمن الجهل. و هو عين مو نُعتت الأزمنة السابقة للنصرانية فى الفقرة: ٣٠ من الاصحاح السابع عشر من سفر اعمال الرسل. اما الاسلام فهو زمن النور و المعرفة. و جهل ضد: علم وردت بهذا المعنى كثيرا فى اللغة القديمة. وردت اكثر فى الازمنة الحديثة من ذلك قول عنترة فى معلقته ع "و ان كنت جاهلة بما لم تعلمى" على ان جولد سهير يرى ان هذا المعنى ثانوى و ان "جهل" معناها الاول ضد "حِلْم" لا علم. فمعناها اذن: قسا، خشن، غلظ (ن، ص، ک)

وهو يستشهد بابيات ترد فيها مشتقات هاتين المادتين متقابلتين. مثال ذلك قول شنفرى لامية العرب (٥٥، ٣) "ولا تزدهى الاجهال حلمى". واستخلص من ذلك ان الجاهلية هى الهمجية.[١٣]

ترجمہ: جاہلیت کا معنی ومفہوم جاننے کے لئے ایک دقیق نظر ڈالی جائے تو اولاً تو عام طور پر وہی خیال رائج ہے جس کی طرف (G.D.Michaelis) وغیرہ کا خیال گیا ہے کہ یہ اسی طرح کا زمانہ جاہلیت ہے جس طرح کہ نصرانیت سے پہلے کے زمانے کا تذکرہ سفر اعمال الرسل کے باب ۱۷، فقرہ: ۳۰ میں ملتا ہے۔ رہا معاملہ اسلام کا تو یہ سراسر نور ومعرفت کا دور ہے۔ اور جہل، علم کی ضد ہے۔ اس معنی میں قدیم عربی زبان میں اس کا استعمال بکثرت ملتا ہے۔ جبکہ جدید عربی زبان میں زیادہ کثرت کے ساتھ یہ کلمہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عنترہ عبسی کے معلقہ میں اس کا یہ قول اسی قبیل سے ہے ع "وإن كنت جاهلة بما لم تعلمى" البتہ گولڈ زیہر کا

خیال ہے کہ یہ معنی ثانوی نوعیت کا ہے اور یہ کہ جہل کا اولین معنی حلم کی ضد ہے نہ کہ علم کی۔ اس صورت میں جہل کا معنی "قسا" یعنی سخت ودرشت ہونا، "خشن" یعنی: سخت وکھردرا ہونا اور "غلظ" یعنی سخت ہونا ہے، کرنا چاہئے۔ وہ اپنے اس دعوے پر ایسے اشعار سے استشہاد کرتا ہے جن میں ان دونوں کلمات (جہل وحلم) کے مشتقات ایک دوسرے کے مقابل پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثال شنفری کا یہ قول ہے: "ولا تزدهى الاجهال حلمى" (جاہلوں کو میرا حلم مغرور نہ بنا دے۔) اس ساری بحث سے میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ جاہلیت، همجيت (بے قاعدگی و بدانتظامی) کو کہتے ہیں۔

تنقیدی جائزہ: اقتباس مندرجہ بالا میں چند باتیں غور طلب ہیں۔ اولاً نصرانیت سے پہلے کے زمانے کی بابت جو حوالہ ملتا ہے، ہمارے پاس موجود اردو نسخے میں اس کی عبارت حسب ذیل ہے:

خدا جہالت کے اوقات سے چشم پوشی کر کے اب ہر جگہ کے سب آدمیوں کو حکم دیتا ہے کہ توبہ کریں۔[١٥] اس فقرے میں "جہالت کے اوقات سے چشم پوشی" کی ترکیب ضرور استعمال ہوئی ہے مگر اس امر کی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ اس معاشرتی حالت کی اصل ہیئت ماہیت اور حقیقت و نوعیت کیا تھی؟ اس کا ذکر کرنے کا مقصد بس اس قدر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کا زمانہ بھی "عہد جاہلیت" ہی کہلاتا ہے۔ اور اس امر کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔ امام ابو عیسیٰ ترمذی کی روایت کردہ حدیث پاک سے بھی اسی امر کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔ روایت کے کلمات حسب ذیل ہیں: قال رسول الله ﷺ: قاربوا و سددوا، فانها لم تكن نبوة قط الا كان بين يديها جاهلية[١٦] ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قریب تر ہو جاؤ اور راہ راست کی جستجو رکھو، اس لئے کہ ہر نبوت ایک جہالت پر مبنی عہد کے بعد ہی آئی ہے۔

البتہ اس سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء کرام اور رسولان عظام کی بعثت کا ایک بڑا مقصد جہالت کا خاتمہ کرنا اور لوگوں کو جاہلیت کے طرز حیات سے چھٹکارا دلا کر نور ومعرفت کی طرف لانا تھا۔ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات نے جہالت کے خاتمہ کا ہی پیغام دیا ہے۔ قرآن حکیم بھی جہل کے خاتمہ کے لئے ہی نازل ہوا۔ اگر اس پر عمل نہیں ہوتا تو جہالت باقی ہی رہے گی۔ یہ بات تو بدیہی ہے کہ جہل کی زیادتی پورے معاشرے کو ادبار و انحطاط کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

فی الحال ہمارا مطمح نظر تو یہ ہے کہ عرب معاشرت کی وہ حالت کہ ذا تیا اپنی اسی شکل میں متعین کی جائے جیسی کہ وہ تھی اور جو قرآن حکیم کا ''الجاھلیہ'' سے مقصود ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ فقرہ بحولہ بالا سے بجز اس بات کے کہ انبیاء کرام جہالت کا خاتمہ کرنے کے لئے تشریف لاتے رہے اور کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔

رہا معاملہ جہل کو علم کی ضد قرار دینے کا تو یہ دعویٰ بھی قابل غور ہے۔ عہد جاہلی کے مشہور شاعر عنترہ عبسی کے جس مصرعہ سے اس امر پر استشہاد کیا گیا ہے اس سے بھی بظاہر اس رجحان کو تقویت ملتی ہے کہ جہل، علم کی ضد ہے عنترہ کا پورا شعر حسب ذیل الفاظ میں ہے ۔

هلا سئلت الخيل يا ابنة مالك   ان كنت جاهلة بما لم تعلمي (١٧)

ترجمہ: اے مالک کی بیٹی اگر تو یہ جاہلانہ حرکت کرنے ہی لگی تھی تو جن جن چیزوں یا واقعات کو تو جانتی نہیں تھی، ان کی بابت ہمارے ساتھی شاہسواروں سے ہی دریافت کر لیتی۔

اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر وہ معلومات لے لیتی تو جاہلانہ حرکت نہ کرتی۔ مگر پلٹ کر ''ان كنت جاهلة بما لم تعلمي'' کے کلمات کو دیکھا جائے تو الجھن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا مستفاد تو یہ ہے کہ جہالت کا سلسلہ معلومات کے حصول کی بناء پر رک سکتا تھا۔ اس طرح ضد کی بجائے عدم علم اور ارتکاب جہل کا باہمی معاملہ تو ایک علت اور معلول کا ہوا۔

عہد جاہلی کے ذخیرۂ اشعار میں ایسی امثلہ اور نظائر اور بھی بہت ہیں مثلاً سموأل بن عادیا کہتا ہے ۔

سلي ان جهلت الناس عنا و عنهم   و ليس سواء عالم و جهول (١٨)

ترجمہ: اگر تم جاہلانہ حرکت کر ہی گزری ہو تو اور ہمارے اور لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرو، اس لئے کہ عالم اور جاہل باہم برابر نہیں ہوتے۔

اس طرح کی چیزوں نے جو ابہام پیدا کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ جہل کی طرف متذکرہ بالا دونوں معانی کی نسبت کر دی گئی۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: جہل کے معنی ''ناواقفی'' اور ''تحتی، درشتی اور اکھڑپن'' کے آتے ہیں۔ (١٩)

مگر مندرجہ بالا دونوں اشعار پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں اشعار میں شاعروں نے اپنی اپنی مخاطب عورتوں کو سرزنش کی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جہل لا

علمی کو نہیں کہتے۔ اس لئے کہ مطلقاً لاعلمی قابل عتاب وملامت نہیں ہوتی۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ عہد جاہلی کے ان شعراء کے نزدیک اگر یہ خواتین پیشگی علم حاصل کر لیتیں تو اس جاہلانہ حرکت سے ضرور باز رہتیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاعلمی جہل ہو یا نہ ہو اس کا جہل کے ساتھ کوئی نہ تعلق ضرور ہے۔ اور ہماری دانست میں ہر دو کا باہمی تعلق ایک علت اور معلول کا تعلق ہے۔ لہٰذا قابل عتاب و سرزنش جاہلانہ حرکت کا کھوج لگانے کے لئے ان واقعات کے پس منظر اور ان اشعار کے سیاق و سباق کی طرف رجوع ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عنترہ بن شداد عبسی کے معلقہ میں جو شعر ہے اس کو اس سیاق وسباق کے تناظر میں رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔ اس شعر میں عنترہ نے اپنی محبوبہ ''عبلہ'' کو جھاڑ پلائی ہے تو اس کا باعث اس کی وہ حرکت ہے جس کا تذکرہ عنترہ نے اس شعر سے قبل نویں شعر میں اس طرح کیا ہے:

ان تغدفي دوني القناع فانني   طب باخذ الفارس المستلئم (٢٠)

ترجمہ: اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ برقعوں کے پیچھے چھپ کر بچ رہو گی تو حقیقت یہ ہے کہ میں زرہ پوش شاہسواروں کو قابو کرنے کی بھی مہارت رکھتا ہوں۔

دراصل شاعر کا خیال ہے کہ محبوبہ نے اس سے جس انداز سے پہلو بچانے کی کوشش کی ہے وہ ناسمجھی اور نادانی کے باوجود اس کی جرأت عمل کا مظہر ہے۔ اس طرح سے قابل عتاب اس جاہلانہ حرکت کا تعین ہو جاتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں سموأل بن عادیا کے شعر کو۔ تو اس کو بھی کچھ اسی نوع کی شکایت ہے۔ اس کو اس کی بیوی نے یہ کہہ کر عار دلائی تھی کہ تم لوگ تعداد میں بہت کم اور تھوڑے سے ہو۔ اور یہ بات تو معروف ہے ہی کہ ''القليل كالمعدوم'' قلیل کی حیثیت ویسی ہی ہے کہ گویا کہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اس طرح سے شاعر کو اپنی توہین اور اس کی طرف سے بے توقیری کا احساس ہوا۔ اس کے جواب میں سموأل نے ایک قصیدہ لکھا اور کھلے لفظوں میں اس نے اس قصیدے میں بیوی کی طرف سے عار دلائے جانے کے واقعہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ کہتا ہے:

اذا المرأ لم يدنس من اللوم عرضه   فكل رداء يرتديه جميل
و ان هو لم يحمل على النفس ضيمها   فليس الىٰ حسن الثناء سبيل
تعيّرنا انا قليل عديدنا   فقلت لها ان الكرام قليل

(۲۱)

ترجمہ: جب تک ایک آدمی بخل سے اپنی عزت کو داغدار نہیں کر دیتا، وہ جو بھی چادر پہنے گا وہی خوبصورت لگے گی، اور اگر وہ اپنے نفس پر ضبط کے بند هن نہیں ڈالے گا تو اس کے لئے اچھائی کے ساتھ متصف ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے، وہ مجھے عار دلاتی ہے کہ ہم لوگ تعداد میں کم ہیں، تو میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ عزت دار لوگ کم کم ہی پائے جاتے ہیں۔

ان اشعار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق لاعلمی کو جہل نہیں کہتے۔ دراصل شاعر کا خیال ہے کہ نا سمجھی اور نادانی کے باوجود اس کی بیوی نے اس کے بارے میں ایک حتمی رائے قائم کر لی اور یہ حرکت جاہلانہ اور قابلِ عتاب وملامت ہے۔ اس لحاظ سے دونوں شعرا اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ نادانی اور نا سمجھی کے باوجود کوئی قطعی فیصلہ کر لینا، حتمی رائے قائم کرنا یا فیصلہ کن اقدام کر گزرنا ان کے نزدیک جہل ہے۔ مطلق لاعلمی، نادانی، اور نا سمجھی جہل نہیں۔

اب آخر میں مشہور مستشرق گولڈ زیہر کی تحقیق وتدقیق پر بھی ایک نظر ڈال لینا اور اس کی نسبت سے اقتباس مندرجہ بالا میں جو نتیجہ فکر دیا گیا ہے اس کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گولڈ زیہر نے لاعلمی کو جہل کا ثانوی معنی قرار دیتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ جہل علم سے زیادہ حلم کی ضد ہے۔ اس نے اپنی تحقیق کی بنیاد جن امور پر رکھی وہ بلاشبہ قابلِ لحاظ ہیں۔ وہ اس طرح کہ لغت کی کتب میں پائے جانے والے بیانات پر انحصار کی بجائے اس نے براہِ راست عہدِ جاہلی کے شعرا سے رجوع کیا ہے۔ اور یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ عہدِ جاہلی کے شعرا اپنے اشعار اور قصائد میں جب یہ کلمہ استعمال کرتے ہیں تو علامات اور آثار وقرائن کیا کہتے ہیں کہ اس کلمہ سے ان کی مراد کیا ہوتی تھی؟ تحقیق کی شروعات اور اٹھان ایک متوازن نہج پر اور نہایت مناسب تھی۔ مگر آگے چل ایک ایسی سنگین غلطی کا سراغ ملتا ہے جس کے باعث ''ڈھاک کے وہی تین پات'' پر آکر بات ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ فکر بھی ''مرغے کی ایک ٹانگ'' سے مختلف نہیں نکلا۔

گولڈ زیہر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ عہدِ جاہلی کے شعرا نے اپنے اپنے قصائد میں ''جہل'' کو بمقابلہ ''حلم'' استعمال کیا ہے۔ اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ مثلاً فرزدق کے اس شعر میں دیکھیے:

فذوا الحلم منا جاهل دون ضيفه وذو الجهل منا عن اذاه حليم (۲۲)

ترجمہ: ہمارے صاحبِ علم لوگ بھی مہمان کے آگے جاہل بن جاتے ہیں اور ہمارے جاہل بھی جب مہمان کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو حلیم بن جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

وفي كثرة الايدي لذي الجهل زاجر وللحلم ابقى للرجال واعود (۲۳)

ترجمہ: اور بہت سے ہاتھوں میں صاحبِ جہل کو ڈانٹ پھٹکار کرنے والی قوت پائی جاتی ہے اور مردوں کے حق میں یقیناً حلم ہی ایک ایسی چیز ہے جو دیرپا اور سودمند ہے۔

زہیر بن ابی سلمیٰ مزنی کہتا ہے:

اذا انت لم تقصر عن الجهل والخناء اصبت حليما او اصابك جاهل (۲۴)

ترجمہ: جب تم جہل اور بیہودہ حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے تو تم کسی صاحبِ حلم کے آڑے آؤ گے یا کوئی جاہل تمہیں پکڑے گا۔

الفند الزمانی جنگِ بسوس کے پس منظر میں کہتا ہے:

وبعض الحلم عند الجهل للذلة اذعان
وفي الشر نجاة حين لا ينجيك احسان (۲۵)

ترجمہ: بسا اوقات ''جہل'' کے مقابلے پر ''حلم'' کا مظاہرہ اپنے اوپر ذلت طاری کرنے کے مترادف ہوتا ہے، اور جب احسان کر کے نجات نہ ملے تو پھر نجات، برائی میں ہی منحصر ہو جاتی ہے۔

اس طرح سے یہ تو طے ہو جاتا ہے کہ عربوں نے جہل اور حلم کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا ہے اور یہ کہ جہل کی ضد حلم ہے۔ اس مقام تک لا کر اقتباس مندرجہ بالا میں یکایک علمی وتحقیقی رویہ ترک کر کے ایک سرسری، سطحی اور عامیانہ انداز اختیار کر لیا گیا ہے۔ اور حلم کے روایتی طور پر معنی متبادر کی ضد کو جہل کا معنی فرض کر لیا گیا ہے۔ اس طرح جہل کا جو معنی برآمد ہوا ہے: ''قسا'' یعنی سخت ودرشت ہونا، ''خشن'' یعنی سخت وکھردرا ہونا اور ''غلظ'' یعنی سخت ہونا کا تعبیری جامہ پہنا کر بحث کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی عرب حلم کو کس کس معنی میں لیتے تھے۔ اس تحقیق کا اعتبار، راہ میں ہی رختِ سفر کھول کر جائے نزول کو منزلِ مقصود قرار

دے لینے کے باعث، جاتا رہا۔ اور فساوت، خشونت اور غلظت جہل کے معانی قرار پا کر رہ گئے۔

حلم کا معنی: عرب ایک وسیع تر معنی کی حامل اصطلاح کے طور پر اپنے کلام میں اس کلمے کو لیتے اور استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ عامر بن ظرب کی عربوں میں جو شہرت اور عظمت ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عرب اس کو فہم و دانش کا پیکر مجسم خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر عامر بن ظرب کو "ذو الحلم" (حلم والا) کے خصوصی لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔

حلم کے عمومی اعتبار سے معنی متبادر کے حوالے سے اہل لغت کی تصریحات حسب ذیل ہیں۔ بلیاوی نے لکھا ہے: صبر و آہستگی، بردباری، کبھی جہل و بے وقوفی کے مقابلے میں آتا ہے، جیسے ان سفاہ الشیخ لا حلم بعدہ، عقل. ج. احلام و حلوم۔ (۲۶)

لویس معلوف نے لکھا ہے: ضد الطیش، وقد یقابل بہ الجھل و السفہ ... الصبر والاناۃ والسکون مع القدرۃ والقوۃ (۲۷) ترجمہ: طیش کی ضد ہے، کبھی اس کو جہل اور بے وقوفی کے مقابلے پر بھی لایا جاتا ہے ... قوت و قدرت کے باوجود صبر، وقار، سکون کا مظاہرہ کرنا۔

قرآن حکیم میں یہ کلمہ سمجھداری اور اور دانائی کے معنی میں آیا ہے:

ام تامرھم احلامھم بھذا (۲۸) ترجمہ: کیا ان کی عقلیں انہیں یہی بتاتی ہیں۔

اسی طرح فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کے طور پر یہ کلمہ قرآن حکیم میں اللہ رب ذوالجلال کی صفت واقع ہونے کے باعث اسمائے صفاتی میں بھی شامل ہے۔ ارشاد باری ہے:

واعلموا ان اللہ غفور حلیم (۲۹) ترجمہ: اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

اسی طرح رسولان عظام اور انبیاء کرام کی صفت کے طور پر بھی یہ کلمہ قرآن حکیم میں آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان ابرھیم لاواہ حلیم (۳۰) ترجمہ: یقیناً ابراہیم ضرور بہت آہیں کرنے والا حلم والا ہے۔

عرب شعرا بھی صاحب حلم کو کم عقلی و بے وقوفی، حماقت و نادانی اور انہی جیسے دیگر رذائل سے مبرا گردانتے ہیں۔ اور جب یہ کلمہ استعمال کرتے ہیں تو اس سے عقل و خرد، فہم و دانش،

در تجربہ و بصیرت ہی مراد لیتے ہیں۔ زہیر بن ابی سلمی مری کہتا ہے۔

و ان سفاہ الشیخ لا حلم بعدہ وان الفتی بعد السفاھۃ یحلم (۳۱)

ترجمہ: اس امر کی صحت میں کوئی شبہ نہیں کہ بوڑھے کی بے وقوفی کے بعد اس کا حلم حاصل کر لینا بے کار ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے وقوفیاں کرتے کرتے ایک نوجوان حلیم بن جاتا ہے۔

اس شعر میں حلم کو سفاہت و بے وقوفی کے مقابلے پر رکھا گیا ہے جس سے حلم کے معنی میں فہم و دانش اور فراست و بصیرت کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ معبد بن علقمہ کہتا ہے۔

و نجھل ایدینا و نحلم رأینا و نشتم بالافعال لا بالتکلم (۳۲)

ترجمہ: ہمارے ہاتھ جہالت کا مظاہرہ کر جاتے ہیں اور ہماری رائے مبنی بر حلم ہی ہوتی ہے، ہم اپنے فعل سے گالیاں دیتے ہیں نہ کہ باتوں سے۔

اس شعر میں حلم کو جہل کے مقابلے پر لا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ جاہل محض زبان سے بک بک کرتے ہیں لہٰذا ہم اپنے افعال سے یعنی زور بازو سے ان کا علاج کرتے ہیں البتہ ہماری سوچ و فکر اور ہماری رائے ہمیشہ بصیرت پر ہی مبنی ہوتی ہے۔ مرار بن سعید کہتا ہے۔

اذا شئت یوما ان تسود عشیرۃ فبالحلم سد لا بالتسرع و الشتم

و للحلم خیر فاعلمن مغبۃ من الجھل الا ان تشمس من ظلم (۳۳)

ترجمہ: جب تم کسی روز کسی قوم پر سرداری کرنا چاہو تو حلم کے ذریعے سے سرداری کرو، نہ کہ جلد بازی اور گالم گلوچ کے زور پر۔ انجام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جہل کے مقابلے میں حلم ہی بہتر ہے، یہ اور بات ہے کہ ظلماً تمہیں دھوپ میں کھڑا کر دیا جائے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ بے سوچے سمجھے کسی معاملے میں کود پڑنا بھی حلم کے منافی اور نری جاہلانہ حرکت ہے۔ اور یہ بھی پتا ملتا ہے کہ بے وجہ ظلم سہتے رہنے کو بھی حلم نہیں کہتے۔ عہد جاہلی ہی کا ایک اور شاعر حارث بن وھلہ الذھلی کہتا ہے:

و زعمتم ان لا حلوم لنا ان العصا قرعت لذی الحلم (۳۴)

ترجمہ: تم لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہم لوگوں میں عقل ہی نہیں، یقیناً لاٹھی تو ایک دانشمند کے لئے ہی کھٹکھٹائی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ دانشمند کے لئے لاٹھی محض کھٹکھٹائی جاتی ہے اور وہ سنبھل جاتا ہے مگر ایک جاہل آدمی کے لئے لاٹھی چلانا پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "قرع عصا" (لاٹھی کھٹکھٹانے) کا

وقوع سب سے پہلے عامر بن ظرب عدوانی کے لئے ہوا۔ تین سو سال کی عمر میں پہنچ کر ان کی عقل میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ تو اس نے اپنی اولاد سے کہا کہ جب تم مجھے گفتگو میں بہکتا ہوا دیکھو متنبہ کر دیا کرو۔(۳۵) عہد جاہلی ہی کا ایک اور شاعر قیس بن زہیر کہتا ہے:

اظن الحلم دل علیّ قومی   وقد یستجهل الرجل الحلیم(۳۶)

ترجمہ: میرا گمان ہے کہ میرے حلم نے میری قوم کو مجھ پر ظلم کا راستہ بتایا ہے، اور کبھی کبھار تو ایک دانا آدمی بھی جاہلانہ حرکتوں میں الجھا دیا جاتا ہے۔ خلف بن خلیفہ کہتا ہے:

علیهم وقار الحلم حتی کانما   ولیدهم من اجل هیبته کهل

اذا استجهلوا لم یعزب الحلم عنهم   وان اثروا ان یجهلوا اعظم الجهل

(۳۷)

ترجمہ: ان پر حلم کا ایسا رعب و وقار طاری ہے کہ ان کے ہاں کا بچہ بھی اپنی ہیبت کے باعث لگتا ہے کہ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے، جب کبھی جاہلانہ حرکتوں میں الجھا دیئے جاتے ہیں تو بھی دانائی ان سے دور نہیں ہوتی اور اگر جہالت کا مظاہرہ کرنے پر ہی آ جائیں تو بہت بڑی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ زہیر بن ابی سلمی مزنی کہتا ہے:

حلماء فی النادی اذا ما جئتهم   جهلاء یوم عجاجة ولقاء(۳۸)

ترجمہ: اپنی قوم کی مجلس مشورہ میں ہوں تو آپ ہمیشہ ان کو دانشمند ہی پائیں گے، البتہ غارتگری یا جنگ کا معاملہ ہو تو آپ ان کو جاہل ہی دیکھیں گے۔

زہیر بن ابی سلمی ایک اور مقام پر قریش مکہ کی شوکت و عظمت اور عالم عرب پر طاری ان کے رعب و دبدبہ کا تفصیلی نقشہ پیش کرنے کے بعد ایک شعر میں کہتا ہے:

وان جئتهم الفیت حول بیوتهم   مجالس قد یشفیٰ باحلامها الجهل(۳۹)

ترجمہ: جب بھی آپ ان کے ہاں جائیں گے تو ان کے دیار میں جابجا آپ کو ایسی مجلسیں ملیں گی جن سے فروغ پانے والے فہم و دانش کے اثر سے جہالت سے شفا مل جاتی ہے۔

ان اشعار اور ان کے نظائر پر غور کیا جائے تو عہد جاہلی کے عرب معاشرے میں صاحب حلم ایسے شخص کو کہتے تھے جو بہ مشق، جہاں دیدہ اور گرم و سرد چشیدہ ہوتا تھا۔ گہرے غور و

خوض اور سوچ بچار کے بعد ہی کسی نتیجہ تک پہنچتا تھا۔ عقل و خرد اور فہم و دانش کا مجسم پیکر ہوتا تھا۔ جلد بازی، کم عقلی، نادانی اور بے وقوفی ایسی کمزوریوں سے مجتنب ہوتا اور رہتا تھا۔ جو الجھے ہوئے اور پیچیدہ مسائل و معاملات کا اپنی عقل و فہم اور تجربہ و بصیرت کے تحت حل دریافت کر لیتا تھا اور کم عقلی و نادانی کی آفات سے خود کو بھی بچائے رکھتا تھا اور اپنی قوم کو بھی۔ یہ خوبیاں اور کمالات عرب معاشرے میں جس شخصیت میں یکجا ہو جاتے تھے اسے وہ دانا و بینا خیال کرتے تھے اسی کو اپنا مقتدا و پیشوا بناتے تھے۔ اپنے معاملات و مسائل حیات حتی کہ روزمرہ کے معمولات میں بھی اسی سے رہنمائی لیتے اور اس شخص کے کہے نے کو وہی مرتبہ اور مقام دیتے تھے جو کہ صرف وحی الٰہی اور رسولان عظام اور انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کو ہی دیا جا سکتا ہے۔ عربوں کے سب سے مشہور و معروف دانشور عامر بن ظرب کو بھی اسی لئے انہوں نے "ذو الحلم" کا خطاب دے رکھا تھا۔ کسی بھی ذوالحلم یا دانشور کا کہا ان کے لئے الہامی دستور کا بدل، دین حق اور شریعت کا درجہ رکھتا تھا۔

مزعومہ حلم کے خطرات: عہد جاہلی کا عرب معاشرہ عقلیت پسندی سے بھی کافی آگے نکلا ہوا اور عقل پرستی کا فریب خوردہ معاشرہ تھا۔ یہ چیز یعنی عقلیت پسندی اگر الہامی دستور کے تابع اور دنیاوی امور و معاملات سے متعلق ہو اور سماجی و معاشرتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہو تو اس میں تو کوئی حرج نہیں کہ ایسے میں عقل و خرد کی بات مانی اور رکھی جائے۔ قباحت اور خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خالص شرعی امور و معاملات کے لئے عقل نارسا کو ایک معیار و پیمانہ اور مدار بنا لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ عقل و خرد کا راہوار اپنے تخیل کی انتہائی بلندیوں کے باوجود اس باب میں ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور ظن و تخمین محض کی بنیاد پر بنائے اور مرتب کئے گئے اعتقادات و نظریات کی صحت اور درستگی کی کوئی ضمانت نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا غلط سلط یا محض ظن و تخمین کی بنیاد پر باندھے گئے اعتقادات و نظریات کے بارے میں امکان غالب یہی ہے کہ وہ امر واقعہ کے خلاف ہی ہوں گے، اس لئے نری جہالت ہی ہو سکتے ہیں۔ علامہ جرجانی کے بیان سے بھی اس امر کی تائید ملتی ہے۔ جہل کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الجهل: هو اعتقاد الشیٔ علی خلاف ما هو علیه(۴۰)

کسی چیز کی بابت اس کی اصل حقیقت کے برخلاف کوئی بھی اعتقاد رکھنا جہل ہے۔

راقم کی دانست میں لفظ جہل کو دو مخصوص حوالوں سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ اولا عربوں کی سوچ کے مطابق اور پھر ایک اسلامی اصطلاح کے طور پر۔ عربوں کی سوچ کا اعتبار کیا جائے تو کم عقلی یا نادانی کی فیصلہ کن حتمی رائے یا عملی اقدام اور اسی طرح بے وجہ عجلت پسندی اور جلد بازی یا مناسب اہتمام اور تیاری کے بغیر بے سوچے سمجھے کسی اہم معاملے میں کود پڑنا بھی جہالت کے زمرے میں آتی ہے۔ سطور بالا میں عنترہ عبسی کے شعر میں بھی یہی مفہوم پنہاں ہے۔ وہ اس بات پر برہم ہے کہ اس نادان فاختہ نے برقعے کے پیچھے چھپ کر مجھ جیسی عقابی نگاہ رکھنے والے جوانمرد سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح سموأل بن عادیا کے اشعار سے بھی یہی تبادر ہوتا ہے کہ اس کم عقل عورت نے کم علمی کی بنیاد پر حتمی رائے قائم کرلی اور یہ فیصلہ کن اقدام بھی کر ڈالا کر مجھے عار بھی دلا دی ہے۔ اور بلاشبہ اوپر بیان کردہ جہل کے معانی کی روشنی میں یہ دونوں حرکات جہالت کے زمرے میں شامل ہیں۔

رہا معاملہ اسلامی اصطلاح کا تو ایک اسلامی اصطلاح کے طور پر اور دینی و شرعی اعتبار سے دیکھا جائے تو جہل یا جہالت اس حتمی رائے یا فیصلہ کن عملی اقدام کو جہالت کہتے ہیں جو ''علم'' سے بے گانہ اور ماوراء ہوتے ہوئے دین اور شریعت کا درجہ حاصل کرلے۔ اسی طرح کوئی ایسا بھی عقیدہ یا پختہ نظریہ جو محض بے بنیاد ہو یا بغیر کسی واقعی چھان بین اور تحقیق کے غلط بنیادوں پر استوار کر لیا گیا ہو اور اس کو وہی تقدس اور احترام بھی دے دیا جائے جو ایک خالص حکم شرع کا حق اور حصہ ہے تو ہماری دانست میں یہ عمل بھی عین جہالت ہوگا۔

علم سے مراد وہ الہامی تعلیمات ہیں جن سے حقائق اشیاء کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ رب ذوالجلال ہی ان تمام اشیاء کا خالق اور صانع ہے۔ وہ ان اشیاء کو وجود میں لانے سے پہلے بھی تھا اور ان سب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اسی کی ذات تعالیٰ ہے جو قائم رہے گی۔ لہٰذا ان اشیاء کی اصل حقیقت کی بابت بس اسی کا کہا معتبر ہے۔ مخلوق میں سے کسی اور کا کہا اس کے کہے کے ہم پلہ تو کجا، اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ گویا اللہ تعالیٰ کا کہا اور سکھایا ہی بس حقیقی معنوں میں علم ہے۔ خواہ یہ تعلیم وحی جلی کی شکل میں ہو یا اس کے رسولوں اور انبیاء کرام کی زبان حقیقت ترجمان سے صادر ہوا ہو۔ کیونکہ یہ بھی وحیٔ خفی کی شکل ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ظن ہے اور ہدایت ایزدی کو چھوڑ کر عقل انسانی کی اختراع میں ظن کی بنیاد پر حتمی رائے کا قیام اور فیصلہ کن اقدام جہالت کے زمرے میں آتا ہے۔ علم و تحقیق کے میدان میں مسلمانوں کی بے بضاعتی

اور بے رغبتی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ان عقلی مفروضات کو جو آئے روز اپنے چولے اور حلیے تبدیل کرتے اور رنگ اور شکلیں بدلتے رہتے ہیں ''علم'' (Science) گنے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسولوں کے ذریعے سے جو کچھ دیا اسے فنون (Arts) کے زمرے میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ حالانکہ معاملہ کلی طور پر اس کے برعکس ہے۔

جہل کی حقیقت قرآن کی روشنی میں: معاملہ خواہ عقائد کا ہو یا اعمال کا جب تک علم نہ ہو کسی بھی طرح کی حتمی رائے قائم کرنے یا فیصلہ کن اقدام کر ڈالنے سے قرآن حکیم نے منع فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تقف ما ليس لك به علم ۚ ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان

عنه مسئولا (۳۱)

ترجمہ: جس معاملے میں تمہیں علم نہ ہو اس میں زرے تُکّے مت ہو۔ حق بات یہ ہے کہ کان آنکھ اور دل سب کے سب سے اس معاملے میں باز پرس ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ومن الناس

من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتاب منير (۳۲)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے معاملے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر علم کے، اور نہ تو ان کے پاس ہدایت ہے اور نہ کوئی روشن کتاب۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

ما لهم به من علم ولا لآبائهم ۚ كبرت كلمة تخرج من افواههم ۚ ان

يقولون الا كذبا (۳۳)

ترجمہ: اس معاملے میں کوئی علم نہیں ان کو اور نہ ہی ان کے آباء اجداد کو، بات دیکھی جائے تو بہت بڑی ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، جو کچھ وہ کہتے ہیں نرے جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔

عدم علم کی صورت میں ہر قول و فعل ہوا و ہوس اور ظن و تخمین کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وما لهم به من علم ۚ ان يتبعون الا الظن ۖ وان الظن لا يغني من

الحق شيئا (۳۴)

ترجمہ: اس معاملے میں انہیں کسی بھی طرح کا کچھ علم نہیں ہے، سراسر گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں گمان کچھ فائدہ نہیں دے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے فرزند کا قصہ: جہل کے معنی و مفہوم کی تعیین سے متعلق اس بحث کو

سمجھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ تصریحات کی روشنی میں قرآن حکیم کی ان آیات کو بھی دیکھ لیا جائے جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ رسول حضرت سیدنا نوح علی نبینا و علیہ افضل الصلوات و التسلیمات کو جاہلوں کے زمرے میں شامل ہونے سے روکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے: حتی اذا جاء امرنا و فار التنور [ل] قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین و اھلک الا من سبق علیہ القول و من اٰمن و ما اٰمن معہ الا قلیل۔ (۴۵)

ترجمہ: یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آن پہنچا اور تنور ابل پڑا ہم نے کہا بٹھالے اس (کشتی) میں ہر جنس میں سے نر و مادہ دونوں اور اپنے گھر والوں کو سوائے اس کے جس کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اور جو بھی ایمان لایا، اور سوائے چند ایک کے ان پر کوئی ایمان نہ لایا تھا۔

اس آیت مبارکہ میں آپ علیہ السلام کے اہل خانہ میں ایک استثناء رکھا گیا ہے۔ "الا من سبق علیہ القول" میں یہ صراحت تو ہے کہ آپ علیہ السلام کے اہل خانہ میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی بابت فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ غرقاب ہی ہوں گے۔ مگر اس امر کی وضاحت موجود نہیں کہ وہ کون کون لوگ ہیں؟ پھر ارشاد باری تعالیٰ ہے: و نادیٰ نوح ربہ فقال رب ان ابنی من اھلی و ان وعدک الحق و انت احکم الحکمین۔ قال یٰنوح انہ لیس من اھلک [ج] انہ عمل غیر صالح [د] فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم [ہ] انی اعظک ان تکون من الجھلین۔ (۴۶)

ترجمہ: اور نوح نے اپنے رب سے فریاد کی، اے میرے رب یہ طے شدہ امر ہے کہ میرا بیٹا میری ال ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے۔ فرمایا: اے نوح حقیقت یہ ہے کہ وہ تیری ال نہیں، یقیناً یہ (اسے ال میں شامل کرنا) ایک نامناسب عمل ہے، تو مت مانگ وہ چیز تو مجھ سے، جس چیز کا تجھے علم نہیں، میں تجھے جاہلوں میں شامل ہونے سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں۔

اِنَّ حرف ہے اور حروف مشبہ بالفعل میں سے ایک ہے۔ عام نحویوں کا خیال ہے کہ بے شک کا معنی دیتا ہے اور جملے میں تیقن پیدا کرنے کے لئے آتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمہ صرف اس جملے کے شروع میں آتا ہے جو فصل الخطاب کی قبیل سے ہو۔ اس معاملے پر تفصیلی گفتگو کسی اور مقام پر آئے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ) حضرت نوح علیہ السلام نے "ان ابنی من

اھلی" کہہ کر بدرجۂ فصل الخطاب کہہ دیا تھا کہ "میرا بیٹا میری ال ہے" اس کے مقابل قرآن حکیم میں یکے بعد دیگرے دو جملے ایسے لائے گئے ہیں جن کا آغاز اِنَّ سے ہو رہا ہے۔ اور دونوں احکم الحاکمین کی طرف سے بطور فصل الخطاب آئے ہیں۔ پھر یہ بھی فرمادیا: "فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم" یعنی "جس چیز کا تجھے علم نہیں، مت مانگ وہ چیز تو مجھ سے"۔ پھر اس کے بعد ہی فرمایا: "انی اعظک ان تکون من الجھلین" یعنی "میں تجھے جاہلوں میں شامل ہونے سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں" لہٰذا نتیجہ یہی سامنے آتا ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے باب میں فصل الخطاب یعنی فیصلہ کن قول یا حتمی رائے و اقدام کا صدور ان آیات مبارکہ کی روشنی میں جہل قرار پاتا ہے۔ سیوہاروی نے لکھا ہے:

"خدا تعالیٰ کے ارشاد "انک" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے درگاہ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ "قیاس" پسند نہ آیا اور ان کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی "وحی" سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اس کو جذبۂ محبت پدری میں اس قدر سرشار نہ ہونا چاہیے کہ "وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے۔" (۴۷)

حاصل کلام: قرآن حکیم نے عربوں کے زمانۂ قبل از اسلام کو "جاہلیت" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے تو اس کا اپنی جگہ ایک طے شدہ اور معین معنی و مفہوم ہے۔ اور وہ یہ کہ شارع صرف اللہ رب ذوالجلال کی ذات ہے۔ اسی کا دیا ہوا دستور عمل اور قاعدہ قانون ہی معتبر اور حرف آخر ہے۔ اسی نے کتاب و حکمت کی تعلیم دینے اور لوگوں کا تزکیۂ نفس کرنے کے مقصد کے تحت ایسی برگزیدہ ہستیوں کا انتخاب کیا ہے جو اللہ کے پیغام کو بنی نوع انسان تک پہنچانے اور لوگوں کو اس پیغام ربانی پر عمل کر کے دکھانے پر مامور تھے۔ اس میں ایک اہم اور خاص نکتہ یہ ہے کہ یہ رسولان عظام اور انبیاء کرام لوگوں کی ہدایت و راہبری اور دعوت الی الحق کے معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی کے فرستادہ اور بارگاہ خداوندی کے اذن یافتہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حسب ذیل ارشاد پاک سے اس امر کا بہت واضح اور بخوبی اظہار ہوتا ہے: یٰایھا النبی انا ارسلنک شاھدا و مبشرا و نذیرا۔ و داعیا الی اللہ باذنہ و سراجا منیرا۔ (۴۸)

ترجمہ: اے نبی یقیناً ہم نے آپ کو "شاہد"، "مبشر" اور "نذیر" بنا کر بھیجا ہے۔ اور "اللہ کی طرف

بتانے والا اسی کی اجازت سے'' اور روشن چراغ بنا کر۔

آپ ﷺ کی طرح دیگر جتنے بھی رسولانِ عظام اور انبیاء کرام شریعت و ہدایت کے ساتھ مبعوث کیے گئے وہ سب بھی "ماذون من جانب اللہ" تھے۔ ان سب کی بعثت اسی مقصد کے تحت ہوئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم اور اس کی مرضی سے ان کی اطاعت کی جائے اور تمام افراد انسانی اور ابنائے جنس ان کی اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی جستجو کریں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اجازت کے بغیر ہی اپنی خواہش کے تحت اور اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کا رسول یا نبی بن بیٹھا ہو۔ یا جس کی تعلیمات میں اس کی خواہش نفس یا ذاتی پسند و ناپسند کا کوئی عمل دخل رہا ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان سب بزرگ ہستیوں کو مبعوث فرمایا تو اس عمل میں حکمت یہی مضمر تھی کہ لوگ ان برگزیدہ لوگوں کی باتیں سنیں اور مانیں اور انہی سے رشد و ہدایت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (۴۹)

ترجمہ: اور ہم نے جس قدر بھی رسول مبعوث فرمائے ہیں، صرف اس مقصد کے تحت کہ اللہ کی اجازت سے ان کی اطاعت اختیار کی جائے۔

لہٰذا کوئی بھی ایسا شخص جو اللہ رب ذوالجلال کی طرف سے ماذون اور رشد و ہدایت کے عمل پر مامور نہ ہو اس کی بتائی ہوئی باتوں پر کلا تکیہ کرکے انہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینا، ایسے لوگوں کو فہم و دانش ہی نہیں رشد و ہدایت کا بھی منبع خیال کرتے ہوئے ان کے احکام کو اپنا دین و ایمان بنا لینا حکمت بعثت کے منافی عمل ہے۔ اور بالخصوص جب بعثت ہو چکی اور وحی الٰہی کے دروازے کھل گئے تو پھر بھی جو لوگ خود کو پرانی اور بے بنیاد باتوں اور روایتوں سے منسلک اور وابستہ رکھنے پر مصر رہیں گے تو بلا شبہ یہ جہالت ہی ہے۔ عرب اپنے بڑوں بوڑھوں اور بزرگوں کو ایسا رتبہ دیتے تھے۔ ان کو ''حکم'' مانتے تھے اور ان کا ''حکم'' مانتے تھے۔ عہد جاہلی کے قدیم شعرا میں سے عمر بن قمیئہ کہتا ہے:

لا تغبط المرا ان یقال لہ   امسیٰ فلان لسنہ حکماً

ان سرہ طول عمرہ فلقد   اضحی علی الوجہ طول ما سلما (۵۰)

ترجمہ: تم کسی بھی آدمی پر محض اس وجہ سے رشک مت کرنا کہ وہ عمر رسیدگی کے باعث حکم ہو گیا ہے،

اگر دراز ئ عمر نے اسے خوشی دی ہے تو یہ بھی تو دیکھو کہ جتنا کچھ وہ جی لیا اس کے آثار بھی تو اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ یعنی جھریاں پڑ گئی ہیں جو بجائے خود فنا کی علامت ہیں۔

پھر اپنے بزرگوں، سرداروں اور آباء و اجداد کا کہا ان کے لئے حرف آخر ہوتا تھا، ان کا دین اور جزو ایمان بن جاتا تھا۔ جس کی خلاف ورزی کا وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ابن اثیر، قریش مکہ کو ایک مرکز پر جمع کرکے نئی زندگی سے ہمکنار کرنے والے اور مشرکین مکہ کے جد امجد قصی بن کلاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

و کان امرہ کالدین المتبع فی حیاتہ و بعد موتہ (۵۱)

ترجمہ: قصی کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے حکم کی وہی حیثیت قائم رہی جو ایک لائق اتباع دین کی ہوتی یا ہو سکتی ہے۔

اسلام تو نور و معرفت کا دین ہے۔ اس نے اگر اس عہد کو جہالت و گمراہی کا نام دیا ہے تو وہ اسی معنی میں ہے کہ ان کی دینی و مذہبی اور معاشی و معاشرتی اور اخلاقی اقدار و روایات حق و صدق کے حقیقی معیار سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ ورنہ تو انسانی تاریخ کا یہ عہد بھی زندگی اور اس کی رونقوں سے معمور اور لبریز ایک عہد تھا اور صدیوں پر محیط تھا۔ جملہ انسانی سرگرمیاں اس عہد میں بھی اپنی مخصوص رفتار اور اپنی وضع قطع کے ساتھ جاری و ساری رہیں۔ خوشی و غمی کے مواقع آتے تو کھل کر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے یہاں بھی میلوں اور بازاروں میں اپنی تہذیب و ثقافت کے مظاہرے عام تھے جن کی تفصیلات اہل علم نے محفوظ کی ہیں۔ علامہ انباری نے ''اسواق العرب المشہورۃ فی الجاھلیۃ و مبایعتھم فیھا'' (۵۲) کے عنوان سے ایک مفصل باب باندھا ہے جس میں ایک درجن کے قریب بازاروں کے نام گنوائے اور ان کی تفصیلات مہیا کی ہیں۔

ان کی زندگی میں بہت کچھ تھا مگر جو کچھ بھی تھا وہ نور معرفت اور علمی حقیقتوں سے کسی طرح ہم آہنگ نہ تھا تو عہد جاہلیت کے پروردہ اور جاہل کہلائے۔ لہٰذا ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے اور پورے طور پر اور ہر ممکن طریقے سے بچنا چاہئے ہر اس عقیدہ و نظریہ سے اور ہر اس قول اور عمل سے جو جہالت کی پیداوار اور اس کا حصہ اور جز ہے۔ ان کے پاس تو ایک عذر بھی تھا کہ وہ اصلاً نور معرفت سے محروم چلے آ رہے تھے ہمارے پاس ایک زندہ و تابندہ کتاب اور روشن

شریعت کی موجودگی میں کسی طرح کا کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔ واللہ المستعان و علیہ التکلان۔

مصادر و مآخذ

۱۔ قرآن حکیم، سورہ شمس، آیات: ۷، ۸
۲۔ قرآن حکیم، سورہ شمس، آیات: ۹، ۱۰
۳۔ قشیری، مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کراچی، قدیمی کتب خانہ، طبعہ ثانیہ ۱۹۵۶ء، ص: ۳۹۷، ج: ۱
۴۔ قرآن حکیم، سورہ آل عمران، آیت: ۱۵۴
۵۔ قرآن حکیم، سورہ مائدہ، آیت: ۵۰
۶۔ قرآن حکیم، سورہ احزاب، آیت: ۳۳
۷۔ قرآن حکیم، سورہ فتح، آیت: ۲۶
۸۔ قرآن حکیم، سورہ نجم، آیت: ۲۸
۹۔ قرآن حکیم، سورہ نحل، آیات: ۲۲، ۱۳۳
۱۰۔ قرآن حکیم، سورہ تکویر، آیات: ۸، ۹
۱۱۔ دارمی، عبداللہ بن عبدالرحمن، شیخ الاسلام، ملتان، نشر السنۃ، سن درج نہیں، ص: ۱۳، ج: ۱
۱۲۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۳۱۲ و ۳۱۳؟
۱۳۔ وجدی، محمد فرید، دائرۃ المعارف القرن العشرین، مادہ: جہل
۱۴۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مادہ: جاہلیہ ۱۵۔ کلام مقدس، عہد نامہ جدید، روما، سوسائٹی آف سینٹ پال، ۱۹۵۸ء، ص: ۱۰۹
۱۶۔ ترمذی، عیسیٰ بن سورہ، ابو عیسیٰ، جامع ترمذی، لاہور، فاروقی کتب خانہ، بلا سن طباعت، ص: ۱۳۶، ج: ۲
۱۷۔ زوزنی، الحسین بن احمد، ابو عبداللہ، شرح المعلقات السبع، کراچی، قدیمی کتب خانہ، بلا سن طباعت، ص: ۱۵۱
۱۸۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، لاہور، مکتبہ سلفیہ، طبع اول ۱۹۹۵ء، ص: ۳۳
۱۹۔ غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، عرب جاہلیہ اولیٰ کے ادبی آثار پر ایک نظر، مطبوعہ فکر و نظر، اسلام آباد، ص: ۶۳، شمارہ ۹، ج ۹، مارچ ۱۹۷۲ء
۲۰۔ زوزنی، الحسین بن احمد، ابو عبداللہ، شرح المعلقات السبع، محولہ بالا، ص: ۱۳۹
۲۱۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۳۴
۲۲۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۳۶۷
۲۳۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۳۰۹

۲۴۔ زہیر بن ابی سلمیٰ مزنی، ربیعہ بن رباح، دیوان زہیر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، الطبعۃ الثانیہ: ۲۰۰۳ء، ص: ۱۰۰
۲۵۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۱۹
۲۶۔ بلیاوی، حفظ الرحمن، مصباح اللغات، مادہ: ح ل م
۲۷۔ لوئیس معلوف، المنجد، مادہ: ح ل م
۲۸۔ قرآن حکیم، سورہ طور، آیت: ۳۲
۲۹۔ قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیت: ۲۳۵
۳۰۔ قرآن حکیم، سورہ توبہ، آیت: ۱۱۴
۳۱۔ زوزنی، الحسین بن احمد، ابو عبداللہ، شرح المعلقات السبع، محولہ بالا، ص: ۹۴
۳۲۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۱۹۴
۳۳۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۸۹۴
۳۴۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۵۰
۳۵۔ گنگوہی، محمد حنیف، نفحۃ الادب، کراچی، میر محمد کتب خانہ، بلا سن طباعت، ص: ۱۳۵
۳۶۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۱۱۹
۳۷۔ ایضاً، ص: ۵۳۷
۳۸۔ زہیر بن ابی سلمیٰ مزنی، ربیعہ بن رباح، دیوان زہیر، محولہ بالا، ص: ۳۳
۳۹۔ ایضاً، ص: ۸۷ ۴۰۔ جرجانی، علی بن محمد، السید الشریف، کتاب التعریفات، مادہ: ج ہ ل
۴۱۔ قرآن حکیم، سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۳۶
۴۲۔ قرآن حکیم، سورہ حج، آیت: ۸، نیز سورہ لقمان، آیت: ۲۰
۴۳۔ قرآن حکیم، سورہ کہف، آیت: ۵ ۴۴۔ قرآن حکیم، سورہ نجم، آیت: ۲۸
۴۵۔ قرآن حکیم، سورہ ہود، آیت: ۳۰ ۴۶۔ قرآن حکیم، سورہ ہود، آیات: ۳۵، ۳۶
۴۷۔ سیوہاروی، حفظ الرحمن، قصص القرآن، لاہور، مکتبہ مدنیہ، بلا سن طباعت، ص: ۳۴۷، ج: ۱
۴۸۔ قرآن حکیم، سورہ احزاب، آیات: ۳۵، ۳۶
۴۹۔ قرآن حکیم، سورہ نساء، آیت: ۹۳
۵۰۔ ابو تمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ، محولہ بالا، ص: ۳۰۲
۵۱۔ ابن اثیر، علی بن ابی الکرم محمد بن محمد، ابو الحسن، الکامل فی التاریخ، بیروت، دار صادر و دار بیروت، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۱، ج: ۲ ۵۲۔ البغدادی، محمد بن حبیب، ابو جعفر، کتاب المحبر، حیدرآباد دکن، جمعیۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۶۱ھ، ص: ۲۶۳، ۲۶۷

سیدنا داؤد علیہ السلام کی مختصر سرگزشت

مولانا عبدالکریم اثری
(صاحب تفسیر عروۃ الوثقیٰ)

سیدنا داؤد علیہ السلام کے والد کا نام ایشا یا ایشی ہے۔ آپ یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں داؤد علیہ السلام کا نسب نامہ تحریر کیا ہے کہ تیرہ واسطوں سے اسحاق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ قرآن کریم نے سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کی اپنے نبی سے کسی شخص کو سپہ سالار بنانے کی اپیل، نبی وقت کا طالوت کو سپہ سالار بنانے اور بنی اسرائیل کی اکثریت کا اس کی سپہ سالاری سے انکار کرنے کا بیان موجود ہے وہ لوگ جنہوں نے طالوت کی سپہ سالاری کو قبول کیا اور طالوت کی معیت میں جہاد فی سبیل اللہ کیا ان میں جالوت کے قتل کرنے والے آپ ہی تھے اور اس قتل جالوت میں بے نظیر شجاعت کے اظہار نے بنی اسرائیل کے قلوب پر داؤد علیہ السلام کی محبت و عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں ہو چکی تھی چنانچہ یہی داؤد آگے چل کر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی و رسول اور بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے رسالت کے منصب کے لئے منتخب کر لئے گئے اور اس کے ساتھ قومی سردار یعنی بادشاہ بھی بن گئے جو اسلام کی نگاہ میں ان کے اجتماعی نظم و ضبط کے لئے ''خلیفہ'' مقرر ہوئے۔

قرآن کریم میں سیدنا داؤد علیہ السلام کا ذکر سورۃ البقرہ، النساء، المائدہ، الانعام، الاسراء، الانبیاء، النمل، سبا اور ص کل ۹ سورتوں میں آیا ہے اور زیادہ تر دونوں باپ بیٹے کا ذکر اکٹھا ہی کیا گیا ہے یعنی داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا۔ نبوت و رسالت اور حکومت میں سے کونسی چیز آپ کو پہلے عطا ہوئی؟ غالباً حکومت آپ کو پہلے ملی کیونکہ طالوت کی موجودگی ہی میں آپ کو عنان حکومت مل گئی تھی اور اس کے جلو میں اللہ تعالیٰ کا یہ انعام بھی ہوا کہ آپ کو منصب نبوت و رسالت سے سرفراز فرما دیا گیا۔ کہا

جاتا ہے کہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط میں اور نبوت و رسالت دوسرے سبط سے چلی آ رہی تھی اور داؤد علیہ السلام پہلے نبی و رسول ہیں جن کو دونوں نعمتیں عطا کی گئیں۔
(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰)

انبیاء و رسل میں سے آدم علیہ السلام کے بعد داؤد علیہ السلام پہلے نبی و رسول ہیں جن کے لئے قرآن کریم نے (خلیفۃ فی الارض) کا لفظ استعمال کیا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے کہ (یداؤد انا جعلنک خلیفۃ فی الارض) (ص ۳۸:۲۶) ''اے داؤد! بلاشبہ ہم نے تم کو زمین میں ''خلیفہ'' بنایا ہے۔ اس میں کیا حکمت تھی؟ بنی اسرائیل میں صدیوں سے یہ رسم قائم چلی آتی تھی کہ حکومت ایک خاندان میں اور نبوت دوسرے میں رکھی گئی تھی چنانچہ اس رسم کے خلاف سیدنا داؤد علیہ السلام میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی جمع کر دی گئی اس لئے ضروری تھا کہ ان کو ایک ایسے لقب سے پکارا جائے جو اللہ تعالیٰ کی صفات علم و قدرت دونوں کا مظہر اتم ہونے میں صراحت کرتا ہو اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے شریعت اسلامی کی اصطلاح میں ''خلیفہ'' سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کی خدمت بھی انجام دیتے اور ان کی اجتماعی حیات کی نگرانی کا فرض بھی ادا فرماتے رہے۔

قرآن کریم، تورات اور اسرائیلی روایات اس کی شاہد ہیں کہ سیدنا داؤد علیہ السلام شجاعت و بسالت، اصابت رائے اور قوت فکر و تدبیر جیسے اوصاف کے پیش نظر کامل و مکمل انسان تھے اور فتح و نصرت ان کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس وجہ ان کے شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ہمیشہ ان کے ہاتھ رہتی اس لئے بہت تھوڑے عرصہ میں شام، عراق، فلسطین اور شرق اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ اور ایلہ (خلیج عقبہ) سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیر نگین تھا اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کر لیا جائے جو ان کے قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے تو یہ کہنا کسی طرح بے جا نہ ہوگا کہ حضرت داؤد کی مملکت و حکومت بلا شرکت ''سامی اقوام'' کی واحد سلطنت تھی، جو جدید فلسفہ تاریخ اقوام کے مطابق ''وحدت عرب'' یا اس سے بھی زیادہ وسیع ''وحدت اقوام سامیہ'' کی حکومت کہی جا سکتی ہے اور پھر کثرت لشکر اور وسعت حدود رقبہ مملکت کے ساتھ ساتھ ''وحی الٰہی'' کے شرف نے ان کی عظمت و شوکت اور صولت و ہیبت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا اور رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے یا ایسی کوئی مہم پیش کر دی جائے جو انتہائی پیچیدہ ہو یا کذب و افتراء نے اس پر زیادہ سے زیادہ ملمع

کر دیا ہو "جب بھی" وحی الٰہی" کے ذریعہ ان پر حقیقت حال منکشف ہو جاتی ہے اس لئے جن وانس کسی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں۔ چنانچہ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا مناقشہ لے کر داؤد علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوئے۔ ہر ایک یہ کہتا تھا کہ یہ میری ملک ہے اور دوسرا غاصب ہے۔ حضرت داؤد نے فیصلہ کا فیصلہ دوسرے دن پر مؤخر کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے مدعی سے فرمایا کہ رات میں اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے لہٰذا تو صحیح صحیح بات بیان کر۔ مدعی نے کہا: خدا کے سچے نبی اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً حق اور سچ ہے لیکن اس واقعہ سے قبل میں نے (مدعی علیہ) کے باپ کو دھوکا دے کر مار ڈالا تھا۔ یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو قصاص میں قتل کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ (تاریخ ابن کثیر ص ۱۴)

اسی قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرمانبردار تھے۔ قرآن کریم کی آیت ذیل میں حضرت داؤد کی اسی عظمت مملکت اور موہبت حکمت و نبوت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وشددنا ملکه واتینه الحکمة وفصل الخطاب (ص ۳۸:۲۰)

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کی قوت بخشی۔

اس آیت اور گزشتہ آیات میں "حکمت" سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال ہے جو مفسرین کے یہاں زیر بحث ہے۔ ہمارے نزدیک اقوال سلف کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ حکمت سے دو باتیں مراد ہیں ایک نبوت اور دوسری عقل و دانش کا وہ مقام جس پر فائز ہو کر کوئی شخص راہ راست کی بجائے کبھی کج روی اختیار نہیں کر سکتا۔ بعض علماء نے حکمت سے زبور مراد لی ہے، اسی طرح "فصل خطاب" سے بھی دو امور کی جانب اشارہ ہے۔

(۱) وہ تقریر و خطابت کے فن میں کمال رکھتے تھے اور اس طرح بولتے تھے کہ لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ جدا جدا فہم و ادراک میں آتا تھا اور اس سے کلام میں فصاحت و لطافت اور شوکت بیان پیدا ہو جاتی تھی۔

(۲) ان کا حکم اور فیصلہ حق و باطل کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتا تھا۔

بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے "اصل اور اساس" تورات تھی لیکن حالات و واقعات اور زمانہ کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد کو بھی خدا کی جانب سے زبور عطا ہوئی جو تورات کے قوانین و

اصول کے اندر رہ کر اسرائیلی گروہ کی رشد و ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی، چنانچہ حضرت داؤد نے شریعت، خوشوئی کو از سر نو زندہ کیا، اسرائیلیوں کو راہ ہدایت دکھائی اور نور وحی سے مستفیض ہو کر تشنہ کامان معرفت الٰہی کو سیراب فرمایا۔

زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن وانس حتی کہ وحوش و طیور تک وجد میں آجاتے۔ اسلئے آج تک "لحن داؤدی" ضرب المثل ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ابوموسیٰ اشعری کے حسن صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے: "ابوموسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤد عطا فرمایا ہے"۔

لغت میں زبور کے معنی پارے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہ کتاب دراصل تورات کی تکمیل کے لئے نازل ہوئی تھی اسی لئے گویا اسی کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہے۔

زبور ایسے قصائد اور مسجع کلمات کا مجموعہ تھا جس میں خدا کی حمد و ثنا اور انسانی عبدیت و عجز کے اعتراف اور پند و نصائح اور بصائر و حکم کے مضامین تھے۔ مسند احمد میں ایک روایت منقول ہے کہ زبور کا نزول رمضان میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی۔ نیز بعض بشارات اور پیشین گوئیاں بھی منقول تھیں، چنانچہ بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مسطورہ ذیل میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بشارت سے متعلق ہے اور وحی اس کا مصداق ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۲ ص ۱۱، ۱۲)

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصلحون. (الانبیاء ۲۱:۱۰۵)

"اور بے شک ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے"۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ تورات، انجیل اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور منزل من اللہ بتایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ و دانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی حتی کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعلی کے درمیان فرق کرنا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔

من الذین هادوا یحرفون الکلم عن مواضعه. (النساء ۴:۴۶)

بعض یہود وہ ہیں جو (تورات و انجیل و زبور) کے کلمات کو ان کی اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے

ہیں۔

چنانچہ تورات وانجیل کے علاوہ خود زبور اس کی زندہ شہادت موجود ہے موجودہ زبور میں ان مختلف حصوں کی تعداد جن کو اہل کتاب کی اصطلاح میں مزبور کہا جاتا ہے ایک سو پچاس ہے، ان حصوں پر جو نام درج ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں، کہ یہ سب حصے حضرت داؤد کے "مزبور" نہیں کیونکہ بعض پر اگر حضرت داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاذ قورح کا اور بعض پر شوشیم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر گنیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض ایسے مزبور بھی ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد تصنیف کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مزبور:

اے خدا اقومیں تیری میراث میں گھس آئی ہیں، انہوں نے تیری مقدس ہیکل کو ناپاک کیا ہے انہوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے۔" (مزبور ۷۹)

اس مزبور میں اس ہولناک واقعہ کا تذکرہ ہے جو بخت نصر (بخت نصر) کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو پیش آیا اور ظاہر ہے کہ وہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آیا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر زبور نازل فرمائی اور ان کے ذریعہ بنی اسرائیل کو رشد وہدایت کا پیغام سنایا۔

ولقد فضلنا بعض النبیین علیٰ بعض واتینا داؤد زبورا۔ (الاسراء ۱۷:۵۵)

اور بیشک ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور بخشی۔

واتینا داؤد زبورا۔ (نساء ۴:۱۶۳) اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤد پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو زبور ختم کر چکے ہوتے۔

حضرت داؤد اور قرآن کریم وتورات:

اس مقام پر قرآن کریم اور تورات کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ قرآن کریم تو حضرت داؤد کو اگر صاحب شوکت وصولت بادشاہ مانتا ہے تو جلیل القدر پیغمبر اور رسول بھی تسلیم کرتا ہے لیکن تورات ان کو صرف "سنگ داؤد" (شاہ داؤد) ہی تسلیم کرتی ہے اور ان کی نبوت ورسالت کا اقرار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ تورات کا انکار تحکم اور بے سروپا بات ہے اور کذب وافتراء پر مبنی ہے۔

خصائص داؤد:

اللہ تعالیٰ نے یوں تو سب ہی پیغمبروں کو خصوصی شرف وامتیاز بخشا ہے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کو بے شمار انعام واکرام سے نوازا ہے، تاہم شرف وخصوصیت کے درجات کے اعتبار سے ان کے درمیان بھی فرق مراتب رکھا ہے اور یہی امتیازی درجات ومراتب ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض ۔ (البقرہ ۲:۲۵۳)

یہ رسول ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن کریم نے چند خصائص وامتیازات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس رسول کو کس درجہ بزرگی اور عظمت عطا فرمائی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ قرآن کریم کی بیان کردہ خصائص انبیاء ورسل میں خاصہ کے وہ منطقی معنی مراد نہیں ہیں کہ کسی دوسرے شخص میں قطعاً اس کا وجود نہ پایا جائے اور وہ وصف صرف اسی کے اندر محدود ہو بلکہ اس مقام پر خاصہ سے وہ وصف مراد ہے جو اس ذات میں تمام وکمال درجہ پر پایا جاتا ہے اور اس کے ذکر سے ذہن فوراً اس شخصیت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اگرچہ بعض حالات میں اُس وصف خاص کا وجود دوسرے نبیوں میں بھی جلوہ گر نظر آتا ہے۔

تسخیر وتسبیح جبال وطیور:

حضرت داؤد علیہ السلام خدائے تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس میں بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور پڑھتے یا خدا کی تسبیح وتہلیل میں مشغول ہوتے تو ان کے وجد آفریں نغموں سے نہ صرف انسان بلکہ وحوش وطیور وجد میں آجاتے اور آپ کے اردگرد جمع ہو کر حمد خدا کے ترانے گاتے اور سریلی اور پرکیف آوازوں سے تقدیس وتسبیح میں حضرت داؤد کی ہمنوائی کرتے اور صرف یہی نہیں بلکہ پہاڑ بھی خدا کی حمد میں گونج اٹھتے۔ چنانچہ داؤد (علیہ السلام) کی اس فضیلت کا قرآن کریم نے سورۂ انبیاء، سبا اور ص میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے:

وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر وکنا فعلین ۝ (الانبیاء ۲۱:۷۹)

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی ایسا کرنے کی قدرت ہے۔

ولقد اتینا داؤد منا فضلاً یا جبال اوبی معہٗ والطیر ۔ (سبا ۳۴:۱۰)

اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو اور پرندو تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔

انا سخرنا الجبال معہٗ یسبحن بالعشی والاشراق ○ والطیر محشورۃ کل لہ اواب ○

(ص ۳۸: ۱۸، ۱۹)

بے شک ہم نے داؤد کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا کہ اس کے ساتھ شام اور صبح تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوتے اور سب مل کر حمد خدا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ چرند اور پرند اور پہاڑوں کی تسبیح زبان حال سے تھی گویا کائنات کی ہر شے کا وجود اور اس کی ترکیب بلکہ اس کی حقیقت کا ذرہ ذرہ خدا کی خالقیت کا شاہد ہے اور یہی اس کی تسبیح و تحمید ہے۔

سیب اگرچہ زبان قال نہیں رکھتا اور نطق سے محروم ہے لیکن اس کی خوشبو اور اس کی لطافت، اس کا حسن اور اس کی نزاکت جدا جدا پکار کر کہہ رہے ہیں۔ (فتبارک اللہ احسن الخالقین)۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے لیکن دوسرے محققین کی رائے یہ ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات حقیقتاً تسبیح کرتے ہیں اور ان کی تسبیح صرف یہی نہیں ہے کہ ان کا وجود زبان حال سے صانع حکیم پر دلالت کرتا ہے اور یہی ان کی تسبیح ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے دوسری جگہ بصراحت یہ اعلان کیا ہے کہ:

تسبح لہ السموات السبع والارض ومن فیھن و ان من شیء الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔ (الاسراء ۱۷ : ۴۴)

آسمان اور زمین اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کا فہم و ادراک نہیں رکھتے۔"

اس آیت میں دو باتیں صاف صاف نظر آتی ہیں ایک یہ کہ کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے اور دوسری یہ کہ جن و انس ان کی تسبیح سمجھنے کا فہم و ادراک نہیں رکھتے اس طرح جب اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے حیوانات، نباتات اور جمادات کی جانب تسبیح فرمائی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ان اشیاء میں تسبیح کا حقیقی وجود موجود ہو اور پھر دوسرے جملہ کو اسی پر اطلاق کیا جائے کہ جن و انس ان کی تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں اگر اس جگہ تسبیح کے حقیقی معنی نہ لئے جائیں بلکہ زبان حال سے تسبیح کرنا اس معنی کو

اختیار کیا جائے تو پھر قرآن کریم کا یہ ارشاد کیسے صحیح ہوگا (ولکن لا تفقھون تسبیحھم) (الاسراء ۱۷: ۴۴) "تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے اس لئے اگر ایک سطحی ذہن ان کو نہیں سمجھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ خدائے واحد لاشریک لہ کی ہستی کا پتہ دے رہا ہے تو تمام اہل مذاہب خصوصاً ہر مسلمان تو بلاشبہ اس کو سمجھتا ہے اور وہ جب کبھی وجود باری پر کچھ سوچتا ہے تو اس کا یقین کر کے سوچتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ہستی کا اقرار کر رہا ہے اور ہر شے کا وجود ہی خود خالق کائنات کا پتہ دے رہا ہے۔

قرآن کریم نے اس آیت سے قبل مشرکین کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو بتایا ہے کہ مشرکین اپنی نا سمجھی اور کج فہمی سے خدا کے ساتھ معبودان باطل کو شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کریم اس مسئلہ کے بطلان کو ان پر واضح کرتا اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے تو ان پر اس کی نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور برتر ہے ان تمام باطل نسبتوں سے جو مشرکین اس کی جانب منسوب کرتے ہیں اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے جو اس قسم کی مشرکانہ گمراہی میں مبتلا ہو رہا ہے ورنہ ساتوں آسمان و زمین اور کائنات کی ہر شے خدا کی پاکیزگی کا بیان کرتی ہے مگر انسان ان کی اس تسبیح کے فہم و ادراک سے قاصر ہے بلاشبہ اللہ بردبار ہے اور بہت ہی پیار کرنے والا ہے۔

سیدنا داؤد علیہ السلام شاہی اور شہنشاہی کے باوجود سلطنت و مملکت کے خزانہ سے ایک حبہ نہیں لیتے تھے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنے ہاتھ کی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اس کو ذریعہ معاش بناتے تھے۔ چنانچہ داؤد علیہ السلام کے اس وصف کو حدیث صحیح میں ان الفاظ کے ساتھ سراہا گیا ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اکل احد طعاما قط خیر امن ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہ۔

(صحیح بخاری کتاب الانبیاء اور کتاب التجارۃ)

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بلاشبہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کر کے رزق کماتے تھے۔"

قرآن کریم نے اس واقعہ کو سورہ الانبیاء اور سبا میں بیان کیا ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ:

وعلمنٰہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من باسکم فھل انتم شاکرون ○ (۲۱:۸۰)

"اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقعہ پر اس سے بچاؤ حاصل ہو

پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو؟"۔

والنا له الحديد٥ ان اعمل سابغات وقدر فى السرد واعملوا صالحاً انى بما تعملون بصيرٌ ٥)(۳۴:۱۰،۱۱)

اور ہم نے اس (داؤد) کے لئے لوہے کو نرم کر دیا کہ وہ زرہیں بنائے کشادہ اور اندازہ سے کڑیاں جوڑ کر اور شاندار عمل کر کے تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو دیکھتا ہوں۔"

تورات اور "لوہے کے استعمال کے زمانے کی تاریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک تو ترقی کر لی تھی کہ فولاد پگھلا کر اس سے سپاٹ ٹکڑے بناتے اور ان کو جوڑ کر زرہیں بنایا کرتے تھے لیکن یہ زرہیں بھاری ہوتی تھیں اور چند قوی ہیکل انسانوں کے علاوہ عام طریقہ سے ان کا استعمال مشکل اور دشوار سمجھا جاتا تھا اور میدان جنگ میں سبک خرامی دشوار ہو جاتی تھی۔ داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بآسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بھی بہت عمدہ ثابت ہوتی تھیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ ان آیات کے پیش نظر سیدنا داؤد علیہ السلام کے اس واقعہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آج لوہے کی صنعت اور خصوصاً اوزار حرب میں مسلمانوں کو وہ مقام حاصل ہوتا کہ دوسری قوموں کے لوگ اس کے مرہون منت ہوتے اور ان پر رشک کرتے اور آلات حرب اور جدید قسم کے اسلحہ کا مرکز و محور مسلمان قرار پاتے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس کو چھو کر بھی نہ دیکھا اور اس میں سب سے بڑا قصور ان لوگوں کا ثابت ہوتا ہے جنہوں نے لوہے کو موم کرنا سیدنا داؤد علیہ السلام کا معجزہ ثابت کرنے کی کوشش کی اور قوم کو بتایا کہ اس سے لوہے کی صنعت و حرفت کا پیشہ مراد نہیں بلکہ اس سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس خام لوہے کو داؤد علیہ السلام ہاتھ لگاتے وہ موم کی طرح نرم ہو جاتا اور آپ کو اس معاملہ میں کوئی کلفت نہ ہوتی جس طرح آج کوئی شخص کسی رسی سے کوئی کام لیتا ہے اس سے بھی زیادہ سہل طریقہ سے آپ خام لوہے کو ہاتھ لگاتے تو خود بخود نرم ہو جاتا وہ لوہا نہ رہا بلکہ موم ہو جاتا یا اس سے بھی زیادہ نرم جو قرآن کریم کے مفہوم کے سراسر خلاف ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن قوموں نے اس لوہے سے کام لینا سیکھا اور قرآن کریم کی اس آیت سے راہنمائی لی آج وہ ترقی کر کے دنیا میں اپنا نام روشن کر گئیں اور مسلمان قوم ان کی بھکاری بن کر رہ گئی اب ان کا جی چاہتا ہے تو وہ ہاسی ٹکڑا ہمارے سامنے مشروط طریقہ

سے پھینک دیتے ہیں اور نہیں چاہتا تو ڈانٹ پلا کر واپس کر دیتے ہیں اور جو حال بھکاریوں کا ہے وہی ان اقوام کے سامنے آج ہمارا ہے اور کوئی شخص آج بھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں کہ ہماری یہ حالت کیوں ہوئی؟ اور کیسے ہم اپنی حالت کو درست کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ان کی یہ کامیابی تو فقط دنیوی ہے اور ہم دین و دنیا دونوں میں کامیابی حاصل کر کے ان کے منہ میں مٹی ڈال کر دکھائیں گے اور غفلت کے سارے پردے چاک کر دیں گے۔

سیدنا داؤد علیہ السلام اور دو اہم تفسیری مقامات:

سیدنا داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں دو اہم مقام ایسے ہیں جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کے تفسیری مباحث کے لحاظ سے بھی اہم شمار ہوتے ہیں اور پہلا مقام اگرچہ اختلافی نہیں ہے مگر دوسرا مقام معرکۃ الآراء بن گیا ہے اور اہل علم کی موشگافیوں نے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اصل حقیقت کو آشکارا کیا جائے اور باطل اوہام و مزعومات کو دلائل و براہین کی روشنی میں رد کیا جائے۔

مقام اول:

وداؤد وسليمن اذ يحكمان فى الحرث اذ نفشت فيه غنم القوم وكنا لحكمهم شاهدين ٥ ففهمنا ها سليمن و كلا اتينا حكما وعلماً۔ (الانبیاء۲۱:۷۸،۷۹)

اور داؤد اور سلیمان (کا واقعہ) جب کہ وہ ایک کھیتی کے معاملہ کا فیصلہ کر رہے تھے جس کو ایک فریق کی بکریوں کے ریوڑ نے خراب کر ڈالا تھا اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت (اپنے علم محیط کے اعتبار سے) موجود تھے پھر ہم نے اس سے (بہترین) فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو عطا کی اور داؤد و سلیمان کو ہم نے علم و حکمت عطا کئے۔

اس آیت کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد (علیہ السلام) کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے، مدعی نے دعوے کی روداد یہ سنائی کہ مدعی علیہ کی بکریوں کے گلے نے اس کی تمام کھیتی تباہ و برباد کر ڈالی اور اس کو چر چگ کر روند ڈالا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم و حکمت کے پیش نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعی علیہ کے گلہ کی قیمت کے قریب قریب متوازن ہے لہٰذا یہ پورا گلہ مدعی کو تاوان میں دے دیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر ابھی گیارہ سال کی تھی وہ والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے

ہوئے تھے، کہنے لگے اگرچہ آپ کا یہ فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعی علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ اس کے دودھ اور اس کی اون سے فائدہ اٹھائے اور مدعی علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس درمیان میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر واپس آجائے تو کھیت مدعی کے سپرد کر دے اور اپنا ریوڑ واپس لے لے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔

قرآن کریم نے بھی اس طرح اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا اور اس واقعہ خاص میں فہم داؤد پر فہم سلیمان کو سبقت لے گئے۔ فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد علیہ السلام کے فیصلہ کو قیاسی کہیں گے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو "استحسانی" مگر اس قسم کی جزئی فضیلت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بحیثیت مجموعی فضائل حضرت سلیمان (علیہ السلام) اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام پر فضیلت رکھتے تھے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجموعہ فضائل کے اعتبار سے حضرت داؤد علیہ السلام کی جو منقبت فرمائی ہے وہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے حصہ میں نہیں آئی۔

مقام ثانی:

تورات اور "اسرائیلی روایات" کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی مضحکہ خیز اور بیہودہ حکایات و قصص منسوب کرتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان مقدس ہستیوں کے متعلق نبی یا رسول ہونے کا تو کیا یقین ہو سکتا ہے یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ وہ با اخلاق بزرگ ہستیاں ہیں۔

بہتان طرازی کی مثال:

چنانچہ ان قصص و حکایات میں سے ایک خرافی روایت حضرت داؤد علیہ السلام سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تورات کے صحیفہ سموئیل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ایک طویل داستان بیان کی گئی ہے جو مختصر الفاظ میں اس کی زبانی سننے کے قابل ہے:

"اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوبصورت تھی۔ تب داؤد علیہ السلام نے لوگ بھیج کر اس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کیا وہ العام کی بیٹی بت سبع نہیں جو حتی اوریاہ کی بیوی ہے؟ اور داؤد علیہ السلام نے لوگ بھیج کر اسے بلا لیا۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس نے اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر اپنے گھر کو چلی گئی اور وہ عورت حامل ہو گئی۔

سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کی میں حاملہ ہوں۔ صبح کو داؤد نے یوآب کے لئے ایک خط لکھا اور اسے اوریاہ کے ہاتھ بھیجا اور اس نے خط میں یہ لکھا کہ اوریاہ کو گھمسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے۔ اور اس شہر کے لوگ نکلے اور یوآب سے لڑے اور وہاں داؤد کے خادموں میں سے تھوڑے سے لوگ کام آئے اور حتی کہ اوریاہ بھی مر گیا۔ تب یوآب نے آدمی بھیج کر جنگ کا سب حال داؤد کو بتایا۔ جب اوریاہ کی بیوی نے سنا کہ اس کا شوہر اوریاہ مر گیا تو وہ اپنے شوہر کے لئے ماتم کرنے لگی اور جب سوگ کے دن گزر گئے تو داؤد نے اسے بلوا کر اس کو اپنے محل میں رکھ لیا اور وہ اس کی بیوی ہو گئی اور اس سے اس کے ایک لڑکا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا۔ (سموئیل ۲ باب ۱۱: ۲ تا ۲۷)

اس داستان میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو اخلاقی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد ان کو نبی اور پیغمبر تو کیا ایک صحیح اخلاق کا انسان بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دوسرے کی بیوی پر نظر بد ڈالنا، اس سے ناجائز طور پر ملوث ہونا اور پھر سازش کر کے اس کے شوہر کو ناحق قتل کروا دینا انسانی زندگی کے وہ ناپاک اعمال ہیں جن کے لئے علم اخلاق کی زبان میں "بدکاری" سے کم کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سبحنک هذا بهتان عظیم۔

تورات کا تضاد بیان:

لیکن اس سے قبل کہ ہم حضرت داؤد علیہ السلام کی معصوم ہستی پر لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کریں خود تورات ہی کی زبانی یہ سنانا چاہتے ہیں کہ دوسرے مقامات پر اس نے حضرت داؤد کی نسبت کیا کہا ہے اور ان کی پاک دامنی اور خدا ترسی کا کس انداز میں ذکر کیا ہے؟

تورات کا صحیفہ سموئیل میں ہے:

"تب ناتن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا۔ جا جو کچھ تیرے دل میں ہے کہہ کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔"

"اور اسی رات کو ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا۔ جا اور میرے بندہ داؤد سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے..... سو اب تو میرے بندے داؤد سے کہہ کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالہ سے جہاں تو بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا لیا تاکہ تو میری قوم اسرائیل کا پیشوا ہو....." (سموئیل ۲ باب ۷: ۳ تا ۷)

"اس نے میرے زور آور دشمن اور میرے عداوت رکھنے والوں سے مجھے چھڑا لیا کیونکہ وہ میرے لئے

نہایت زبردست تھے، وہ میری مصیبت کے دن مجھ پر آپڑے پر خداوند میرا سہارا تھا۔ وہ مجھے کشادہ جگہ میں نکال لایا، اس نے مجھے چھڑایا اس لئے کہ وہ مجھ سے خوش تھا۔ خداوند نے میری راستی کے موافق مجھے جزا دی اور میرے ہاتھوں کی پاکیزگی کے مطابق مجھے بدلہ دیا کیونکہ میں خداوند کی راہوں پر چلتا رہا اور شرارت سے اپنے خداوند سے الگ نہ ہوا کیونکہ اس کے سارے فیصلے میرے سامنے تھے اور میں اس کے آئین سے برگشتہ نہ ہوا۔ میں اس کے حضور کامل بھی رہا اور اپنی بدکاری سے باز رہا اس لئے خداوند نے مجھے میری راستی کے موافق بلکہ میری اس پاکیزگی کے مطابق جو اس کی نظر کے سامنے تھی بدلہ دیا۔"

(سموئیل ۲ باب ۲۲:۱۸ تا ۲۵)

داؤد بن یسی کہتا ہے یعنی یہ اس شخص کا کلام ہے جو سرفراز کیا گیا اور یعقوب کے خدا کا ممسوح اور اسرائیل کا شیریں نغمہ ساز ہے۔ خداوند کی روح نے میری معرفت کلام کیا اور اس کا سخن میری زبان پر تھا.....

(سموئیل ۲ باب ۲۳:۱ تا ۳)

"سلیمان نے کہا تو نے اپنے خادم میرے باپ داؤد پر بڑا احسان کیا اس لئے کہ وہ تیرے حضور راستی اور صداقت اور تیرے ساتھ سیدھے دل سے چلتا رہا...... سو اس (سلیمان) نے کہا خداوند اسرائیل کا خدا مبارک ہو جس نے اپنے منہ سے میرے باپ داؤد سے کلام کیا...... اور داؤد کو چنا تا کہ وہ میری قوم اسرائیل پر حاکم ہو۔

اب اے خداوند اسرائیل کے خدا اپنے بندے میرے باپ داؤد کے ساتھ اس قول کو بھی پورا کر جو تو نے اس سے کیا تھا کہ تیرے پاس میرے حضور اسرائیل کے تخت پر بیٹھنے کے لئے آدمی کی کمی نہ ہوگی بشرطیکہ تیری اولاد جیسے تو میرے حضور چلتا ہے ویسے ہی میری شریعت پر عمل کرنے کے لئے اپنی راہ کی احتیاط رکھے...... پھر بھی میں ساری سلطنت کو نہیں چھینوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کی خاطر جسے میں نے چن لیا ہے ایک قبیلہ تیرے بیٹے کو دوں گا......" (سلاطین ۱ باب ۱۱:۱۳)

اور ایسا ہوگا کہ اگر تو ان سب باتوں کو جن کا میں تجھے حکم دوں سنے اور میری راہوں پر چلے اور جو کام میری نظر میں بھلا ہے اس کو کرے اور میرے آئین و احکام کو مانے جیسا میرے بندہ داؤد نے کیا تو میں تیرے ساتھ رہوں گا اور تیرے لئے ایک پائیدار گھر بناؤں گا جیسا میں نے داؤد کے لئے بنایا اور اسرائیل کو تجھے دوں گا۔ (سلاطین ۱ باب ۱۱:۳۸)

یہ تمام عبارات بھی تورات ہی کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد خدا کے مختار اور پسندیدہ بندے تھے، بلا واسطہ اس سے ہمکلام ہونے کا شرف رکھتے تھے، خدائی شریعت کے کامل مطیع و فرمانبردار

تھے، راست باز، پاک دامن اور باعفت بزرگ تھے اور خدا کے دیے ہوئے ملک میں بنی اسرائیل کے امیر اور خلیفۃ اللہ تھے، ہر وقت خدا کی حفاظت و صیانت ان کی کفیل تھی، گویا برگزیدہ "پیغمبر" اور صاحب اقتدار "حکمران" تھے۔ پس نہیں کہا جا سکتا کہ اہل کتاب تورات کے ان متضاد بیانات میں کس طرح تطبیق دیتے ہیں اور حضرت داؤد کی شخصیت ان کی نگاہ میں کیا وقعت رکھتی ہے؟ اگر داؤد "نبی" ہیں یا اخلاق حسنہ سے متصف "کنگ داؤد" ہیں تو حتی اور یاہ کی عورت سے متعلق داستان کا ان کے پاس کیا جواب ہے اور اگر اور یاہ کی بیوی کا واقعہ صحیح ہے تو اس سطور بالا منقبت و مدحت کا استحقاق کس داؤد کو حاصل ہے۔

اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور معصوم پیغمبر ہیں، خلیفۃ اللہ اور بنی اسرائیل کے امیر و حکمران ہیں۔ وہ کہتا ہے:

ولقد فضلنا بعض النبيين على بعض و اٰتينا داؤد زبورا ۔ (الاسراء ۱۷:۵۵)

اور بلاشبہ ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

ووهبنا لداؤد سليمٰن نعم العبد انه اواب ۔ (ص ۳۸:۳۰)

اور ہم نے داؤد کو سلیمان بخشا، داؤد اچھا بندہ ہے بلاشبہ وہ خدا کی رحمت کی جانب رجوع ہونے والا ہے۔

ولقد اٰتينا داؤد منا فضلا ۔ (سبا ۳۴:۱۰)

اور بلاشبہ ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی۔

وشددنا ملكه و اٰتينٰه الحكمة وفصل الخطاب ۔ (ص ۳۸:۲۰)

اور ہم نے اس (داؤد) کو مضبوط ملک عطا کیا اور حکمت سے نوازا اور حق و باطل کے فیصلہ کی قوت عطا فرمائی۔

ولقد اٰتينا داؤد و سليمٰن علما وقال الحمد لله الذى فضلنا على كثير من عباده المؤمنين ۔ (النمل ۲۷:۱۵)

اور بلاشبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو "علم" سے بہرہ ور کیا اور ان دونوں نے کہا "اس اللہ کے لئے ہر طرح کی حمد جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت اور برتری عطا فرمائی۔

ان تمام آیات میں حسب عادت قرآن کریم نے کتب سابقہ کے ان خیالات کی تردید اور اصلاح فرمائی ہے جو ان کے پیروؤں کی تحریف و تبدیل کی بدولت ان میں بطور معتقدات داخل ہو گئے

ہیں۔ اس نے تاریخ کے اس تاریک پردہ کو چاک کر کے بتایا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نبی اسرائیل میں مقدس ہستیاں گزری ہیں وہ خدا کے سچے نبی اور پیغمبر ہیں اور ہر قسم کے گناہ اور نافرمانیوں سے مقدس اور پاک ہیں۔

مگر افسوس اور سد ہزار افسوس کہ قرآن کریم کے اس مقدس اعلان کے باوجود حتی اوریاہ کی بیوی کی اس خرافی داستان کو تورات اور اسرائیلیات سے لے کر بعض مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں نقل کر دیا اور اسرائیلی خرافات کو بلا دلیل وسند اسلامی روایات کی حیثیت دے دی۔

ان سادہ لوح بزرگوں نے یہ مطلق خیال نہیں فرمایا کہ جن خرافی داستانوں کو آج وہ اسرائیلی روایات کی حیثیت سے قرآن کریم کی تفسیر میں نقل کر رہے ہیں کل وہ آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح سمجھی جا کر امت مرحومہ کے لئے فتنہ سامانی کا باعث بنیں گی اور ان کی گمراہی کا سبب ثابت ہوں گی اور حیرت در صد حیرت ہے بعض ان جدید و قدیم متکلمین پر جنہوں نے اس قسم کی ہذیانات کو سختی کے ساتھ رد کر دینے اور ان بہتان طرازیوں کو مردود قرار دینے کے بجائے ان روایات کے نیک محمل تلاش کر کے ان کو قابل قبول بنانے کی سعی نامشکور فرمائی ہے اور بے محل حسن ظن سے کام لے کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ یہ تاویلات جو اس خرافی روایات کے بارہ میں کی جارہی ہیں، ریت کی دیوار اور تار عنکبوت ہیں اور کسی نہ کسی اسلوب کے ساتھ اس کو تسلیم کرنے سے "عصمت انبیاء" جیسے اہم اور بنیادی اسلامی عقیدہ پر ضرب کاری لگاتی ہیں اور یہ کہ انبیاء و رسل کی جانب اس قسم کے انتساب سے جبکہ قرآن کریم کا دامن پاک اور بے لوث ہے اور وہ اس قسم کی روایات کو بہتان عظیم سمجھتا ہے تو پھر کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس تفسیر میں اس قسم کی خرافات کا تذکرہ کرے۔

بہر حال ان مفسرین نے جن آیات کی تفسیر میں اس زہر ہلاہل کو ملایا ہے وہ سورۂ ص میں حضرت داؤد کے اس واقعہ سے متعلق ہے۔

وھل اتک نبأ الخصم اذ تسوروا المحراب ○ اذ دخلوا علیٰ داؤد ففزع منھم قالوا لا تخف خصمان بغی بعضنا علیٰ بعض فاحکم بیننا بالحق ولا تشطط واھدنا الیٰ سواء الصراط ○ ان ھذا اخی لہ تسعٌ وتسعون نعجة ولی نعجة واحدة فقال اکفلنیھا وعزنی فی الخطاب ○ قال لقد ظلمک بسوال نعجتک الیٰ نعاجہ وان کثیراً من الخلطاء لیبغی بعضھم علیٰ بعض الا الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت وقلیل ما ھم وظن داؤد انما فتنہ فاستغفر ربہ وخر راکعا واناب ○ فغفرنا لہ ذٰلک وان لہ عندنا لزلفیٰ وحسن

مآب ○ یٰداؤد انا جعلنک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذابٌ شدید" بما نسوا یوم الحساب ○ (ص ۳۸: ۲۱ تا ۲۶)

اور کیا تجھ کو ان (جھگڑنے) والوں کی خبر پہنچی ہے جب وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں گھس آئے داؤد کے پاس تو داؤد ان سے گھبرایا بولے گھبراؤ نہیں ہم دو جھگڑ رہے ہیں۔ زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو ہمارے درمیان انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے اور ٹالنے والی بات نہ کرنا اور ہم کو سیدھی راہ بتا یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے یہاں ایک دنبی ہے، پس یہ کہتا ہے کہ وہ ایک بھی میرے حوالہ کر دے اور مجھ سے گفتگو میں بھی تیز ہے، داؤد نے کہا وہ اپنی دنبیوں میں تیری ایک دنبی کو ملانے کے لئے جو سوال کرتا ہے ظلم کرتا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں لا یہ کہ جو ایمان لائے اور عمل کئے انہوں نے نیک اور ایسے بہت کم ہیں اور داؤد کے خیال میں گزرا کہ ہم نے اس کا امتحان لیا پس مغفرت چاہنے لگا وہ اپنے رب سے اور گر پڑا سجدہ کرا اور رجوع ہوا (خدا کے سامنے) پھر ہم نے اس کو وہ کام معاف کر دیا اور اس کے لئے ہمارے پاس (عزت کا) مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔ اے داؤد ہم نے تجھ کو ملک میں (اپنا) نائب مقرر کیا ہے سو تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کر اور نفس کی خواہش پر نہ چل کہ وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھلا دے جو لوگ اللہ کی راہ کو بھلاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

آیات کی باطل تفسیر:

اس جگہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک امتحان کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو پیش آیا۔ حضرت داؤد نے اول اس کو نہیں سمجھا مگر یکایک دل میں یہ خیال آیا کہ یہ منجانب اللہ ایک آزمائش ہے لہٰذا فوراً ہی اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کی طرح حق تعالیٰ کی جانب رجوع کیا، استغفار کیا اور درگاہ الٰہی میں ان کا استغفار قبول ہو کر ان کی عظمت شان اور تقرب الی اللہ کا باعث بنا۔

معاملہ صرف اسی قدر تھا لیکن بعض مفسرین نے جب یہ دیکھا کہ قرآن کریم نے اس آزمائش کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور تورات اور "اسرائیلی روایات" میں اوریاہ کی بیوی کی ایک داستان موجود ہے جس میں حضرت داؤد سے خدا کی ناراضی کا بھی ذکر ہے تو بلا تامل اس خرافات کو اس آیت کی تفسیر بنا کر آزمائش، استغفار اور قبول استغفار کو اس کے ساتھ چسپاں کر دیا۔

یہ دیکھ کر جلیل القدر مفسرین اور محققین سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے روشن دلائل و براہین

کے ساتھ یہ واضح کیا کہ اس خرافی روایت کا سورۂ ص کی ان آیات کی تفسیر سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ پوری داستان از اول تا آخر یہودیوں کی من گھڑت اور پر از بہتان روایتیں ہیں جن کے لئے اسلامیات میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

قد ذکر المفسرون ھھنا قصۃ اکثر ھا ما خوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعۃ (تفسیر ابن کثیر سورہ ص)

اس جگہ مفسروں نے ایک ایسا قصہ بیان کیا ہے بلاشبہ جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے لیا گیا ہے اور اس بارے میں رسول اکرم ﷺ سے ایک حدیث بھی موجود نہیں ہے کہ جس کی پیروی ضروری ہو جائے۔

اور اپنی تاریخ البدایہ والنھایہ میں اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ فرماتے ہیں۔

قد ذکر کثیر من المفسرین من السلف والخلف ھھنا قصصا واخبارا اکثر ھا اسرائیلیات ومنھا ماھو مکذوب لا محالۃ ترکنا ایراد ھاقی. کتابنا قصدا اکتفاء واقتصارا علی مجرد تلاوۃ القصۃ من القران العظیم واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم.

اور بہت سے اگلے اور پچھلے مفسروں نے اس مقام پر چند قصے اور حکایتیں نقل کی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر یہودیوں کی من گھڑت روایتیں ہیں اور بعض ان میں سے یقینی طور پر جھوٹی اور باطل ہیں ہم نے اس لئے ان کو قصداً بیان نہیں کیا اور قرآن عظیم نے جس قدر واقعہ بیان کیا ہے صرف اسی قدر بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے راہ مستقیم پر چلاتا ہے۔

اور کتاب الفصل میں حافظ ابو محمد بن حزم ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وھذا قول صادق صحیح لا یدل علی شی مما قالہ المستھزء ون الکاذبون المتعلقون بخرافات ولدھا الیھود (الفصل فی الملل والنحل ج ۴ ص ۱۴)

اور قرآن کا یہ قول سچا اور صحیح ہے اور یہ کسی طرح بھی اس روایت پر دلالت نہیں کرتا جس کو ان مسخروں، کاذبوں نے بیان کیا ہے جو ایسی خرافات سے لپٹے رہتے ہیں جن کو یہود نے ایجاد کیا ہے۔

اسی طرح نسیم الریاض میں خفاجی نے، شفاء میں قاضی عیاض نے، بحر المحیط میں ابو حیان اندلسی نے تفسیر کبیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اور دیگر محققین نے ان تمام خرافات کو مردود قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ میں نبی معصوم سے کوئی تفصیل منقول نہیں ہے۔

آیات کی صحیح تفسیر:

پھر ان تمام خرافات سے الگ ہو کر ان محققین نے آیات کی جو تفسیریں کی ہیں وہ یا صحیح آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں اور یا قرآن کریم کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر ذوق سلیم کے ذریعہ کی گئی ہیں۔ اس لئے یہی صحیح اور قابل توجہ ہیں۔

(۱) علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ دو شخص اچانک محراب داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام عبادت الٰہی میں مشغول تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ حقیقی اور واقعی تھا اور ان کو اس کے طے کرانے میں عجلت تھی اس لئے وہ دیوار پھاند کر چلے آئے، حضرت داؤد نے مدعی کا بیان سن کر تذکیر و وعظ کے پیش نظر اول زمانے کے فساد حال کا ذکر کیا اور فرمایا کہ زبردستوں پر ارباب قوت کے مظالم کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ وہ ان کی زندگی کو صرف اپنی راحت کا ایک آلہ سمجھتے رہے ہیں اور یہ بہت ہی بری بات ہے۔ البتہ اللہ کے مومن بندے جو نیکوکار بھی ہیں ایسے مظالم سے بچتے اور اللہ کا خوف کرتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد نے انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے قضیہ کو ختم کر دیا جب فریقین چلے گئے تو حضرت داؤد کے بلند احساسات نے ان کے قلب و دماغ کو ادھر متوجہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم الشان حکومت اور بے نظیر سلطنت جو ان کو بخشی ہے در حقیقت یہ ان کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے اور امتحان ہے اس امر کا کہ ذات واحد نے اپنی اس کثیر مخلوق پر مجھ کو عزت و بلندی عطا فرمائی ہے، اس سے متعلق عائد شدہ فریضہ کو میں کہاں تک صحیح طور پر انجام دیتا اور خدا کی اس نعمت کا اپنی عملی زندگی سے کس طرح شکر ادا کرتا ہوں۔

چنانچہ حضرت داؤد پر اس وجدانی کیفیت کا اس قدر اثر پڑا کہ فوراً درگاہ الٰہی میں سربسجود ہو گئے اور طلب مغفرت کرتے ہوئے اعتراف کرنے لگے کہ خدایا اس عظیم المرتبت ذمہ داری سے سبکدوش ہونا بھی میری اپنی طاقت سے باہر ہے جب تک کہ تیری اعانت شامل حال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند آیا اور اس کی مغفرت نے ان کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لیا۔

ابن حزم اس تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ "استغفار" خدا کی درگاہ میں ایسا محبوب عمل ہے کہ اس کیلئے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اس سے پہلے گناہ اور معصیت وجود میں آئے اور پھر اس کے رد عمل کے طور پر طلب مغفرت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "استغفار" اللہ کے ملائکہ سے بھی ثابت ہے حالانکہ قرآن حکیم نے تصریح کی ہے کہ اللہ کے ملائکہ کی شان یہ ہے (لا یعصو ... ما امرھم ویفعلون مایؤمرون)

(التحریم ۶۶:۶) ''وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

چنانچہ قرآن حکیم نے فرشتوں کے استغفار کا اس طرح ذکر کیا ہے:

ویستغفرون للذین امنوا ربنا وسعت کل شیء رحمۃ وعلما فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک. (المومن ۴۰:۷)

اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں مومنوں کے لئے (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو ہر شے پر اپنی رحمت اور اپنے علم سے چھایا ہوا ہے تو بخش دے ان کو جو تیری جانب رجوع ہوتے ہیں اور تیری راہ کی پیروی کرتے ہیں۔

ابن حزم کی اس تحریر کی تائید میں ہم اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت داؤد کے زیر بحث واقعہ میں قرآن کریم نے ان کے عصیان اور گناہ کا مطلق کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ (فتناہ) کہہ کر صرف یہ بتایا ہے کہ ان کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا اور آزمائش کے لئے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ اور خطا سے ہی متعلق ہو جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ امتحان کا معاملہ پیش آیا۔ لہٰذا حضرت داؤد کا یہ معاملہ بھی کسی معصیت یا گناہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پیغمبرانہ شان کے مطابق احساس فرض اور خدا کے حضور میں اپنی عبودیت و بیچارگی کا بہترین مظاہرہ تھا۔ اس پر مزید بھی بہت کچھ بیان کیا جاسکتا ہے لیکن اس جگہ اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سیدنا داؤد علیہ السلام کی عمر اور وفات:

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے سو سال عمر پائی اور اسرائیلیوں میں چالیس سال حکومت کی اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کو نبوت و رسالت پہلے عطا ہوئی اور حکومت بعد میں ملی چنانچہ تحریر ہے کہ:

''اور داؤد بن ایشی نے سارے اسرائیلیوں پر سلطنت کی اور وہ عرصہ جس میں اس نے اسرائیل پر سلطنت کی چالیس برس کا تھا اس نے حبرون میں سات برس اور یروشلم میں تینتیس برس سلطنت کی اور اس نے بڑھاپے میں خوب عمر رسیدہ ہو کر اور دولت و عزت سے آسودہ ہو کر وفات پائی۔'' (تواریخ ا باب ۲۹:۲۶،۲۸)

عبداللہ بن عباس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام کا انتقال اچانک سبت کے دن ہوا وہ سبت کے دن مقررہ عبادت میں مشغول تھے کہ اچانک اس حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (فیض الباری جلد ۴ کتاب الانبیاء)

تورات کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''داؤد اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور داؤد کے شہر صیہون میں دفن ہوا'' (سلاطین ا باب ۱۱:۲)

سیدنا داؤد علیہ السلام کے اس تذکرہ سے جو درس ہم کو ملتا ہے وہ کیا ہے؟:

سیدنا داؤد علیہ السلام کی مقدس زندگی کے واقعات و حالات نے ہمارے لئے جن بصیرتوں اور عبرتوں کو پیش کیا ہے وہ اگرچہ بہت وسیع دائرہ رکھتی ہیں تاہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کر دینا مفید مطلب نظر آتا ہے تاکہ ان سے ہم بھی درس حاصل کر سکیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ جب کسی ہستی کو اولوالعزم بناتا ہے تو اس کی شخصیت کو خاص فضائل سے سرفراز کر دیتا ہے اور ان کے فطری جوہر کو شروع ہی سے چمکا دیتا ہے اور اس میں بہادری اور اولوالعزمی ہر بینا آنکھ کو نظر آنے لگتی ہے۔ غور کرو کہ داؤد علیہ السلام کو زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جالوت جیسے جابر و قاہر بادشاہ کے مقابلہ میں لا کر ان کے ہاتھوں سے جالوت کو قتل کروا دیا جس سے آپ کی شجاعت کا سکہ اہل یہود کے دلوں میں بیٹھ گیا۔

۲۔ بسا اوقات ایک معمولی انسان کو اللہ تعالیٰ اٹھا کر آسمان رفعت پر پہنچا دینا چاہتا ہے تو اس سے ایسے کام سرزد ہونے لگتے ہیں اور وہ اس طرح انہی کاموں کے باعث آسمان رفعت کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور اس طرح ہوتے ہوتے وہ مرجوب چیز تک پہنچ جاتا ہے یہ سنت اللہ آج بھی جاری و ساری ہے اگر کوئی بینا آنکھ رکھتا ہے تو وہ یہ دیکھ سکتا ہے جو چیز ختم ہوئی ہے وہ فقط نبوت و رسالت ہے نبی اعظم و آخر ﷺ کی نبوت و رسالت کی دعوت قیامت تک جاری و ساری رہے گی اور دعوت حق جاری ہو تو داعی حق کیوں نہیں ہوگا؟

۳۔ خلیفۃ اللہ اور طاغوتی بادشاہی کے درمیان واضح فرق موجود ہے اول الذکر میں ہر قسم کی سطوت و شوکت کے باوجود فروتنی، تواضع اور خدمت خلق نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں اور ثانی الذکر میں کبر، انانیت، جبر اور قہرمانیت کا غلبہ پایا جاتا ہے اس لئے وہ کبھی دونوں ایک طرح کے نہیں ہو سکتے۔

۴۔ قانون الٰہی ہے کہ جو ہستی عزت اور عروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کے فضل و کرم کا اعتراف کرتی ہے اسی قدر اس کو بیش از بیش انعام و اکرام سے اور زیادہ نوازا جاتا ہے۔ داؤد علیہ السلام کی زندگی ہمیں یہ درس بھی دیتی ہے۔

۵۔ دین و مذہب کا تعلق اگرچہ روحانیت سے ہے تاہم مادی طاقت و قوت بھی اس کی بہت حد تک پشت پناہ ہے اس لئے دونوں کا اجتماع نور علی نور ہے جس کی فضیلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سے طاغوتی طاقت و قوت قطعاً مراد نہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے اور توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ ہر حال میں ہونا چاہئے اور خصوصاً دنیوی طاقت سطوت آنے کے بعد ان کی طرف زیادہ متوجہ رہنا چاہئے۔

۷۔ اسلام کبھی دنیوی ترقی حاصل کرنے کے خلاف نہیں لیکن اس سلسلہ کا ہر قدم اسلامی ہدایات کے مطابق اٹھنا ضروری ہے طاغوتی راہنمائی میں اٹھایا گیا ہر قدم سیدھی راہ سے دور ہی کرتا چلا جائے گا۔

۸۔ اسلام کی نظر میں عقل وفکر کا استعمال آزادی کے ساتھ کرنے کا حق ہر انسان کے لئے ہے اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا الا یہ کہ چھوٹے سے جب کسی ایسی بات کا اظہار ہوگا تو اس کو سراہا جانا بہت ضروری ہے تاکہ اس کی ہمت اس راہ میں مزید ترقی پذیر ہو لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں یہ بات الٹ ہو چکی ہے۔

۹۔ غیر نبی کے مقابلہ میں انبیاء کرام اور رسل عظام کا درجہ عظمت بہت زیادہ ہے اور یہ بھی کہ انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں ان کے متعلق کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہو جو اخلاقیات سے گری ہوئی ہو تو اس کا صاف انکار کر دینا لازم وضروری ہے بشرطیکہ اس کا مفہوم اس کے سوا اور ممکن نہ ہو، اگر مفہوم علاوہ مشہور ومعروف مفہوم کے ممکن ہو تو وہی بیان کرنا مفید مطلب ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ قومی مناصب میں سے کسی منصب پر فائز کر دے تو اس منصب سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے اور قومی فائدہ کو پیش نظر رکھنا ہر حال میں ضروری ہے خواہ اپنا ذاتی نقصان کر کے وہ حاصل کرنا پڑے اور اس بات کو ہر حال میں یاد رکھنا چاہئے اور اس معاملہ میں اپنا تجزیہ کرتے رہنا چاہئے۔

منہاج تحقیق

(نوآموز تحقیق کاروں کے لیے)

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

بنیادی اور ثانوی ماخذ کا فرق اور محقق کی مشکلات

بنیادی ماخذ (Primary Sources)

بنیادی ماخذ سے مراد وہ حقائق ہیں جنہیں چشم خود دیکھا یا بہ اذن خود سنا جائے۔ جس طرح مرئی (Visible) اشیاء کے لئے چشم دید شہادت بنیادی ماخذ ہے اسی طرح سنی جانے والی آوازوں کے لئے اذن شنید گواہی بھی بنیادی ماخذ ہے۔ البتہ مرئی اشیاء کی گواہی میں سماعت کو بنیادی ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

متنی تحقیق میں کسی مطبوعہ کتاب کی اشاعت اول کے نسخے (Copies) بھی بنیادی ماخذ میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسے راقم الحروف کی کتاب "اصول تفسیر وتاریخ تفسیر" کے نسخے ۱۰۰ البتہ متعدد اشاعتوں کی صورت میں وہ نسخہ بنیادی سمجھا جائے گا، جسے مصنف نے نظر ثانی یا نظر ثالث کے بعد صحیح قرار دیا ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور قلمی کتاب کے نسخوں میں نقد داخلی وخارجی کے بعد جو نسخہ مستند قرار پاتا ہے، اسے بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔

جے۔ لیونرڈ بیٹس (J. Leonard Bates) کے بقول بنیادی ماخذ دو قسموں میں منقسم ہیں۔

قسم اول میں (1) ذاتی کاغذات (2) دستاویزی ریکارڈ (3) انٹرویوز (4) متفرقات شامل ہیں۔

قسم دوم میں (1) مرکزی حکومت کی مطبوعات (2) صوبائی حکومت کی مطبوعات (3) خود نوشت سوانح عمریاں اور یادداشتیں (4) مجموعہ ہائے خطوط، تقریرات (5) اور معاصر مضامین شامل ہیں۔ 2*

ثانوی ماخذ (Secondary Sources)

ثانوی ماخذ سے مراد وہ معلومات و اطلاعات ہیں جنہیں بچشم خود نہ دیکھا جائے یا با ذن خود نہ سنا جائے۔ یہ ان افراد کے فراہم کردہ ریکارڈز ہوتے ہیں جو خود شریک واقعہ نہیں ہوتے بلکہ کسی شریک واقعہ فرد کی روایات پر ریکارڈ تیار کرتے ہیں۔

مصنف، جب کسی تصنیف کا حوالہ یا اقتباس دیتا ہے تو اسے بھی ثانوی اور بالواسطہ ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔ ہر چند وہ حوالہ یا اقتباس مصنف کے لئے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ پیچھے حاشیہ میں ایم سلطانہ بخش کی مرتبہ کتاب کا ریفرنس مذکور ہوا۔ جب کہ راقم کے لئے ہے۔ لیوز ڈیلنس کا حوالہ ثانوی اور بالواسطہ ماخذ ہے۔

یونہی کسی کتاب کا ترجمہ، خواہ وہ کتنا ہی اہم اور ضروری کیوں نہ ہو، ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسے جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن کا اردو ترجمہ 3* وقس علی ھذا۔

علاوہ ازیں ذرائع ابلاغ میں اخباری صحافت، ریڈیائی صحافت، اور ٹیلی ویژن صحافت کے ذریعے شائع، نشر یا ٹیلی کاسٹ ہونے والی خبریں اپنے قارئین، سامعین اور ناظرین کے لئے ثانوی ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ جب کہ یہی ثانوی ماخذ، ذرائع ابلاغ میں امور متعلقہ سے وابستہ افراد کے لئے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا نوعیت بدل جانے سے ماخذ کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی بنیادی ماخذ، ثانوی میں اور ثانوی ماخذ، بنیادی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

بنیادی اور ثانوی ماخذ کے فرق کی مثال

بنیادی اور ثانوی ماخذ کے فرق کی مثال یوں دی جاسکتی ہے۔

ایم سلطانہ بخش اور محمد طفیل ہاشمی کی تحریر کردہ نصابی کتب 4* کہ جنہیں (نصابی کتب ہونے کے ناطے) ثانوی ماخذ میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی محقق ایم۔ فل اسلامیات کے ان "مطالعاتی رہنماؤں" پر کسی قسم کا کوئی کام کرے تو یقیناً یہ نصابی کتاب ثانوی کی بجائے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔

ریکارڈز اور آثار

دستاویزی تحقیق میں کئی قسم کے ریکارڈز آثار (Remains) سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

وان ڈیلن (Van Dalen) کے حوالے سے وہ ریکارڈز اور آثار یہ ہیں۔

(1) سرکاری ریکارڈز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کی دستاویزات جیسے آئین، قوانین، چارٹرز اور عدالتی روئدادیں وغیرہ۔

(2) ذاتی ریکارڈ ۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً ڈائریاں، خودنوشت سوانح عمریاں، خطوط، وصیت نامے، جائیداد کے کاغذات، معاہدات اور بیمہ کے اشارات۔

(3) زبانی روایات (Oral Traditions) ۔۔۔۔۔۔ مثلاً اساطیر، لوک کہانیاں، خاندانی کہانیاں، تحسین، تجربات اور واقعات

(4) تصویری ریکارڈ ۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً تصویریں، متحرک تصویریں، مائیکرو فلمیں، مصوروں کے نمونے، سکے اور مجسمے

(5) مطبوعہ مواد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً اخبار، کتابچے اور رسالے۔

(6) میکانکی ریکارڈ ۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً انٹرویوز اور اجلاس۔

(7) آثار (Remains) ۔۔۔۔۔ مثلاً آثار قدیمہ کی دستاویزات۔

(الف) مادی آثار ۔۔۔۔۔۔۔ مثلاً عمارتیں، فرنیچر، ساز و سامان، ملبوسات اور اوزار و آلات۔

(ب) مطبوعہ آثار ۔۔۔۔۔۔ مثلاً نصابی کتب، معاہدات، حاضری کے فارم اور اخباری اشتہارات۔

(ج) خطی امداد ۔۔۔۔۔۔ مثلاً مخطوطات۔ ہیروز، ایسی تختیاں (اینٹیں) جن میں خط میخی میں تحریر ہوتی ہے۔ چمڑے پر لکھے ہوئے مخطوطات اور جدید دور کی ٹائپ کی ہوئی دستاویزات نیز مصوری کے نمونہ جات۔

(8) متفرقات ۔۔۔۔۔ مثلاً فن کے مختلف نمونے اور یادگاریں 5*

تاریخی تحقیق کے سلسلہ میں بشا اور ہارٹر (Busha and Harter) نے جن مصادر و ماخذ کو بیان کیا ہے، وہ یہ ہیں۔

(۱) سالنامے ۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے کتب خانوں یا دیگر اداروں کی سالانہ رپورٹیں۔

(۲) آرکائیوز (Archives) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے پبلک اور سرکاری دستاویزات۔

(۳) کیٹلاگ (Catalogue) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے اشیاء یا کتب کی مکمل فہرست جو عموماً وضاحتی